صفر المظفر ۱۴۳۸ھ
نومبر ۲۰۱۶ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

اصلاحِ معاشرہ کا قرآنی تصوّر

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ

داعیٔ رجوع الی القرآن بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

حصہ اول سُورۃ الفاتحہ و سُورۃ البقرۃ مع تعارفِ قرآن
صفحات:360، قیمت 475روپے

حصہ دوم سُورۃ آلِ عمران تا سُورۃ المائدہ
صفحات 321، قیمت 425روپے

حصہ سوم سُورۃ الانعام تا سُورۃ التوبہ
صفحات 331، قیمت 425روپے

حصہ چہارم سُورۃ یُونس تا سُورۃ الکہف
صفحات 394، قیمت 485روپے

حصہ پنجم سُورۃ مریم تا سُورۃ السّجدۃ
صفحات 480، قیمت 575روپے

حصہ ششم سُورۃ الاحزاب تا سُورۃ الحجرات
صفحات 484، قیمت 590روپے

حصہ ہفتم سُورۃ قٓ تا سُورۃ النّاس
صفحات 560، قیمت 650روپے

یکے از مطبوعات: انجمن خُدّام القرآن خیبر پختونخوا، پشاور

شائع کردہ: مکتبہ خُدّام القرآن لاہور
K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد : 65

شمارہ : 11

صفر المظفر 1438ھ

نومبر 2016ء

فی شمارہ -/30

مُدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِتعاون

- اندرون ملک 300 روپے
- بھارت و بنگلہ دیش 900 روپے
- ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ 1200 روپے
- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ 1500 روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700، فون: 3-35869501

فیکس: 35834000، ای میل: maktaba@tanzeem.org

ای میل برائے ادارتی امور: publications@tanzeem.org

ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو، لاہور

فون: 36316638 - 36366638

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال — 5

جمہوریت اور بادشاہت — ادارہ

بیانُ القُرآن — 9

سورۃ النّمل (آیات ۱ تا ۴۴) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

تعمیرِ سیرت و کردار — 25

اصلاحِ معاشرہ کا قرآنی تصور — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

تذکّر و تدبّر — 49

قرآنِ کریم کی اُصولی باتیں (۱۴) — ڈاکٹر عمر بن عبد اللہ المقبل

دعوت و تحریک — 59

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تُو! — محمد عمران ریاض

حقیقتِ زندگی — 65

وجودِ مادّی سے معرفتِ الٰہیہ تک — راحیل گوہر

حقیقتِ تصوّف — 73

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور تصوف — مفتی امانت علی قاسمی

تذکیر و موعظت — 85

نیکی پھیلانا اور برائی مٹانا — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

یادِ رفتگاں — 89

حاجی عبدالواحد صاحبؒ کی یادداشتیں (۱۰) — پروفیسر حافظ قاسم رضوان

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

جمہوریت اور بادشاہت

سپریم کورٹ نے پانامہ لیکس کی تحقیقات کے حوالے سے امیر جماعت اسلامی سینیٹر سراج الحق‘ تحریک انصاف کے چیئرمین عمران خان اور دیگر درخواست گزاروں کی دائرکردہ آئینی درخواستوں کی ابتدائی سماعت کے بعد وزیراعظم پاکستان میاں نواز شریف‘ وزیرخزانہ اسحاق ڈار‘ وزیراعظم کے خاندان کے مختلف افراد‘ ڈی جی ایف آئی اے اور چیئرمین ایف بی آر سمیت مختلف افراد کو نوٹس جاری کرتے ہوئے انہیں دو ہفتوں کے اندر اندر جواب داخل کرنے کا حکم جاری کیا ہے۔ اس سے قبل اورنج لائن منصوبہ پر پنجاب حکومت کی اپیل کی سماعت کے دوران سپریم کورٹ نے اپنے ریمارکس دیتے ہوئے کہا کہ ملک میں جمہوریت کے نام پر بادشاہت قائم ہے۔ چیف جسٹس نے مزید کہا کہ عوام سے جمہوریت کے نام پر مذاق ہو رہا ہے۔

محترم قارئین! میثاقِ جمہوریت کے بعد سیاسی پنڈتوں نے جس طرح یکسو یک آواز ہو کر ملک میں جمہوریت کے استحکام کا بیڑا اُٹھایا تھا‘ اس سے لگ تو یہی رہا تھا کہ اب سیاستدان اور عوامی نمائندے اپنے سابقہ کرتوتوں سے تائب ہو کر عوام کے مسائل کا حل اپنی پہلی ترجیح قرار دیں گے اور عوام کو انصاف ان کی دہلیز پر مہیا کریں گے تاکہ پاکستانی سیاست پر لگے داغ مٹ سکیں اور ’’جمہوریت کی حرمت‘‘ بڑے بوٹوں تلے روندے جانے کا امکان نہ رہے۔ لیکن سیاستدانوں نے NRO کی گنگا جل میں نہا کر سب سے پہلے سابقہ کرپشن کو ٹھکانے لگایا اور پھر تازہ دم ہو کر پہلے سے بھی دس گنا زیادہ تیزی اور اعتماد کے ساتھ لوٹ مار کا سلسلہ شروع کیا۔ انہیں اب اپوزیشن کا دھڑکا بھی نہ رہا تھا‘ کیونکہ ملک کی دو بڑی سیاسی پارٹیوں نے آپس میں مک مکا کر لیا تھا اور چھوٹی پارٹیاں وزارتوں‘ مراعات اور مفادات کے چکر میں دونوں بڑی پارٹیوں میں سے کسی ایک کا ساتھ دینے پر مجبور تھیں۔ لہٰذا میثاقِ جمہوریت‘ میثاقِ لوٹ کھسوٹ میں بدل گیا‘ یہاں تک کہ اپوزیشن کا تصور بھی جاتا رہا اور ملک کے بڑے سیاسی دھڑے ملوکیت کی طرز کی سیاسی بادشاہت کے تحفظ کے ایجنڈے پر یکساں عمل پیرا ہوئے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کشمیر کے ڈوگرہ راجہ نے انگریز سرکار سے کشمیری عوام کی آزادی ۷۵ لاکھ روپے میں خرید لی تھی‘ بالکل ایسے ہی میثاقِ جمہوریت میں بھی دراصل پاکستانی عوام کے سیاسی حقوق خرید لیے گئے ہیں۔ اب پاکستانی عوام چاہے جئیں یا مریں انہیں اپنے اوپر جمہوریت کے نام

پر مسلّط بادشاہتوں کو جھیلنا ہوگا۔ چنانچہ جس طرح کشمیری عوام نے ڈوگرہ شاہی حکومت کی سختیوں کو جھیلا‘ روکھی سوکھی کھا کر گزارا کیا‘ لیکن ڈوگرہ بادشاہت کو اُدھار اٹھا کر ٹیکس بھی دیا‘ زمینوں کا بھاری مالیہ ادا کرنے کی بجائے زمینیں ہی چھوڑ دیں‘ اسی طرح پاکستانی عوام بھی غربت‘ مہنگائی‘ بے روزگاری سے تنگ آ کر خودکشیاں اور خودسوزیاں کر رہے ہیں جبکہ پاکستانی ’’بادشاہوں‘‘ کا مال بیرون ممالک میں بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ گزشتہ دو سال میں پاکستان سے سوئس بینکوں میں جتنا پیسہ گیا ہے اس کی وجہ سے سوئس بینکوں میں پاکستانی رقوم کا حجم بھارت اور کئی عرب ممالک کے حجم سے بھی بڑھ گیا ہے۔ جبکہ دوسری جانب پاکستان پر بیرونی قرضوں کا حجم بھی اسی تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ یہاں تک کہ اب ریڈیو پاکستان اور پی ٹی وی کی کئی عمارتیں گروی رکھ کر قرضے حاصل کیے جا رہے ہیں۔ ان قرضوں کی وجہ سے پاکستانی عوام پر ایک طرف ٹیکسوں اور دوسری طرف مہنگائی کی صورت میں دوہرا قہر برس رہا ہے۔ اس قہر آلود معیشت میں لوگوں کے پاس سر چھپانے کے لیے چھت نہیں‘ دو وقت کا چولہا جلانے کے لیے روزگار نہیں‘ اپنی بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کرنے کے لیے وسائل نہیں‘ جبکہ دوسری طرف پاکستانی عوام کے پیسے سے برسراقتدار خاندانوں کے شہزادوں اور شہزادیوں کی پبلسٹی پر کروڑوں روپے اس طرح صرف ہو رہے ہیں جیسے ملک میں مغل ایمپائر پھل پھول رہی ہو اور ملک کے نامور سیاستدان ان شہزادوں اور شہزادیوں کے دائیں بائیں آگے پیچھے دست بستہ ہی کھڑے رہتے ہیں۔ گویا ان سے وابستگی سیاسی مستقبل کی ضمانت ہے۔

میثاقِ جمہوریت پر ’’عمل درآمد‘‘ کے نام سے ملک میں جاری جمہوریت نما ملوکیت کا ذائقہ بدلنے کے لیے اگرچہ ملک کی ’’دیدہ ور‘‘ نادیدہ قوتوں نے تحریک انصاف کی صورت میں تیسری بڑی سیاسی قوت کی تعمیر کا کام بھی بڑی تیزی سے کیا لیکن ملک کے بڑے سیاسی دھڑوں کے گٹھ جوڑ نے اس تیسری قوت کو اتنی حیثیت بھی نہیں دی جتنی مغل بادشاہت میں چند سر پھرے باغی شہزادوں کو دی جاتی تھی۔ اس کا اندازہ پہلے دھاندلی کے حوالے سے بے اثر ہوتے طویل دھرنوں اور اب پانامہ لیکس کے معاملے پر تحریک انصاف کی سرپٹول سے لگایا جا سکتا ہے جس کی مطلق پروا نہیں کی جا رہی۔ پانامہ لیکس کا معاملہ سامنے آئے تقریباً چھ ماہ ہو چکے ہیں۔ کئی ممالک کے سربراہان اور سیاسی عہدیداروں نے پانامہ لیکس کے سامنے آتے ہی اپنے عہدوں سے استعفے دے دیے لیکن پاکستان میں میثاقِ جمہوریت سے ملوکیت میں بدلتی جمہوریت کے پائے استقلال میں لرزش تک نہ ہوئی۔ جب عوام کے ساتھ ظلم اور ناانصافی ہو رہی ہو تو ان کے سیاسی نمائندوں کا یہ کام ہوتا ہے کہ وہ اس ظلم اور ناانصافی کے خلاف آواز اٹھائیں‘ لیکن جب سیاسی نمائندے خود ہی ظلم اور ناانصافی پر اُتر آئیں تو پھر آواز کون اُٹھائے؟ چنانچہ یہی وہ مجبوری ہے اور یہی وہ حالات ہیں جن کی بنا پر بالآخر چیف جسٹس آف پاکستان کو کہنا پڑا

کہ پاکستان میں جمہوریت کے نام پر بادشاہت قائم ہے۔

ابھی تو جمہوریت کے تازہ دورانیے کو صرف آٹھ سال ہی ہوئے ہیں۔ ابھی تو ابتدائے عشق ہے‘ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟ ویسے یہ جمہوریت سے عشق کا بھوت کبھی کا اُتر چکا ہوتا اگر درمیان میں فوجی آمریتیں اس عشق کو بار بار تازہ کرنے کا باعث ثابت نہ ہوتیں۔ نظریے سے انحراف اور مغرب کی نقالی کے ثمرات پاکستان بننے کے آٹھ دس سال بعد ہی سامنے آنا شروع ہو گئے تھے۔ چنانچہ ۱۹۵۸ء میں منتخب صدر نے خود پہلے مارشل لاء کو لبیک کہا۔ سکندر مرزا نے اختیارات فوج کے حوالے کرنے سے قبل اپنے ایک ہنگامی فرمان میں لکھا: ’’سیاسی جماعتوں کی ذہنیت اتنی پست ہوگئی ہے کہ مجھے اس بات کا کوئی بھروسہ نہیں رہا کہ انتخابات ملک کے موجودہ داخلی انتشار کو سدھار سکتے ہیں یا ان کے ذریعے ایک ایسی مضبوط اور مستحکم حکومت لائی جاسکتی ہے جو ان بے شمار پیچیدہ مسائل کو حل کر سکے جو ہمیں درپیش ہیں۔ آسمان سے نئے لوگ اُتر کر نہیں آئیں گے۔ وہی گروہ جس نے پاکستان کو تباہی کے کنارے پر لا کھڑا کیا ہے‘ انتخابات کو محض اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کرے گا۔‘‘

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان میں اسلامی نظام کبھی جمہوریت کے ذریعے نہیں آ سکتا‘ لیکن ہم چاہتے ہیں کہ جب تک ملک میں انقلاب کے ذریعے اسلامی فلاحی نظام نہیں آ جاتا جمہوری نظام کو جاری رہنا چاہیے‘ کیونکہ ہم جمہوریت کو ملوکیت‘ آمریت اور بادشاہت وغیرہ سے بہتر طرزِ حکومت سمجھتے ہیں۔ لیکن پاکستان میں جمہوریت کی تاریخ کوئی اتنی اچھی نہیں رہی جس سے ہم مزید اُمید لگا سکیں۔ سکندر مرزا کے بعد ایوب خان کی فوجی آمریت میں لوگ ایک بار پھر جمہوریت کی طرف دیکھنے پر مجبور ہوئے۔ چنانچہ دوبارہ ’’روٹی‘ کپڑا اور مکان‘‘ کے پرکشش نعروں سے قوم کو فریب دیا گیا۔ یہاں تک کہ ’’روٹی‘ کپڑا اور مکان‘‘ کے نعرے لگانے والوں نے خود سول مارشل لاء کے نام سے شہریوں پر گولیاں برسائیں۔ پاکستان کی تاریخ نے جمہوریت کے نام پر بادشاہی کا یہ حقیقی روپ بھی دیکھا۔ اس دوران اگرچہ جمہوریت کی بجائے ’’نظامِ مصطفیٰ ﷺ‘‘ کی گونج بھی سنائی دی لیکن جنرل ضیاء الحق کے دورِ آمریت نے پھر جمہوری نظام کی طرف پلٹنے پر مجبور کیا۔ پھر ۱۹۸۸ء سے لے کر ۱۲/اکتوبر ۱۹۹۹ء تک لوگوں نے ایک بار پھر جمہوریت کا مزہ شدید ترین مہنگائی‘ کرپشن‘ اقرباء پروری‘ افراتفری اور انتشار کی صورت میں چکھا‘ یہاں تک کہ ۱۲/اکتوبر کو لوگوں نے آمریت کی آمد پر مٹھائیاں تقسیم کیں۔ پرویز مشرف کے ان آٹھ سالوں نے جمہوریت کی یاد پھر تازہ کر دی‘ یہاں تک کہ ملک کو میثاقِ جمہوریت کے آسیب نے آ جکڑا۔ اب یہ آسیب پاکستانی عوام کا پیچھا کب چھوڑتا ہے یہ خدا ہی جانتا ہے‘ تاہم ایک بات واضح ہے کہ چیف جسٹس کے ریمارکس سے جمہوریت کا اصل چہرہ ایک بار پھر ظاہر ہونا شروع ہو گیا ہے۔ اگر اللہ کرے چند سال مزید جمہوریت کا تسلسل قائم رہ جائے تو جنہیں

جمہورت کی اصلیت نہیں معلوم انہیں بھی آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو ہی جائے گا۔

علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۰ء میں خطبہ الٰہ آباد میں اسلامی ریاست کا تصور پیش کیا تھا‘ لیکن اس سے بھی پہلے یکم جنوری ۱۹۳۰ء کو سالِ نو کے موقع پر آل انڈیا ریڈیو لاہور کی استدعا پر ایک پیغام میں فرمایا تھا: ’’اس زمانے میں ملوکیت کے استبداد نے جمہوریت‘ قومیت‘ اشتراکیت‘ فسطائیت اور نہ جانے کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔ ان نقابوں کی آڑ میں دنیا بھر میں قدرِ حریت اور شرفِ انسانیت کی ایسی مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ جن نام نہاد مدبروں کو انسانوں کی قیادت اور حکومت سپرد کی گئی ہے وہ خون ریزی‘ سفاکی اور زیردست آزادی کے دیو ثابت ہوئے۔‘‘

ہم علامہ اقبال کو مصورِ پاکستان اور محمد علی جناح کو قائداعظم اور بانیٔ پاکستان تو مانتے ہیں لیکن ان کے حقیقی تصورِ پاکستان کو دل سے تسلیم کرنے کے لیے ابھی تک تیار نہیں ہوئے۔ چنانچہ اس منافقت پر ٹھوکروں پر ٹھوکریں کھائے جا رہے ہیں۔ ۶۹ سال سے اعلیٰ سیاسی عہدوں پر سرمایہ داروں‘ وڈیروں‘ جاگیرداروں اور گدی نشینوں کا قبضہ ہے اور ہم ہر منتخب ہو کر آنے والی حکومت کو جمہوری حکومت ہی خیال کرتے ہیں۔ مسلم لیگ ن اور ق کے حالیہ انٹرا پارٹی الیکشنز اس مغالطے کا واضح ثبوت ہیں جن میں سرمایہ دار‘ وڈیرے اور جاگیردار بلا مقابلہ اعلیٰ عہدوں پر بٹھائے گئے ہیں اور اس انتخاب کو بھی جمہوری انتخاب ہی کہا گیا ہے۔ پاکستان کے مسندِ اقتدار پر قابض یہ چند خاندان عالمی بادشاہت کے ایسے ہی باجگزار ہیں جیسے کسی زمانے میں چھوٹے راجے‘ مہاراجوں کے باجگزار ہوتے تھے۔ چنانچہ تمام پالیسیاں‘ تعلیمی نصاب اور قوانین اپنی معاشرت‘ تہذیب اور عوام کی مرضی کے مطابق بنانے کے بجائے عالمی بادشاہت کی تابعداری میں بنائے جاتے ہیں۔ تحفظ حقوقِ نسواں بل‘ غیرت کے نام پر قتل کا بل اس کی ادنیٰ سی مثالیں ہیں‘ لیکن حقیقت میں پاکستان کا معاشی‘ معاشرتی اور سیاسی نظام اسی عالمی بادشاہت کی مرضی کا مظہر ہے۔ کاش! پاکستانی عوام اس حقیقت کو بھی سمجھیں اور ایسے غلامانہ نظام کے بجائے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے نظام کو ملک میں نافذ کرنے کی جِدّو جُہد کریں جس میں اللہ نے ہمارے تمام معاشی‘ سیاسی‘ معاشرتی‘ اخلاقی اور روحانی مسائل کا فطری حل رکھا ہے۔ ورنہ جب تک ہم سیاست کو دین سے دور رکھیں گے کبھی جمہوریت اور کبھی آمریت کے ذریعے طاغوتی طاقتیں ہم پر مسلط رہیں گی۔ کیونکہ ؎

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے‘ تو رہ جاتی ہے چنگیزی!

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ النَّمْل

تمہیدی کلمات

سورۃ النمل اس اعتبار سے پورے قرآن میں ایک منفرد سورت ہے کہ اس میں مکی سورتوں کے تین مضامین یعنی التذکیر بآ لاء اللّٰہ' انباء الرسل اور قصص النبیین اکٹھے ہو گئے ہیں۔ ان میں سے دو مضامین پچھلی سورت یعنی سورۃ الشعراء میں بھی آئے ہیں۔ وہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ قصص النبیین کے انداز میں ہے جبکہ باقی سورت پر انباء الرسل کا رنگ غالب ہے۔ اس کے مقابلے میں سورۃ النمل ان تین موضوعات کے تحت تقریباً برابر برابر تین حصوں میں تقسیم ہے۔ اس میں تین رسولوں (حضرت موسیٰ' حضرت لوط اور حضرت صالح علیہم السلام) کے واقعات انباء الرسل کے انداز میں ہیں جبکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر قصص النبیین کی طرز پر ہے۔ آخر میں سورت کا تقریباً ایک تہائی حصہ التذکیر بآ لاء اللّٰہ پر مشتمل ہے۔

آیات ۱ تا ۶

طٰسٓ قف تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ ۙ﴿۱﴾ هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ﴿۲﴾
الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴿۳﴾ اِنَّ
الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ ۗ﴿۴﴾ اُولٰٓئِكَ
الَّذِيْنَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْعَذَابِ وَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ﴿۵﴾ وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى
الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ ﴿۶﴾

آیت ۱ ﴿طٰسٓ قف تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱﴾﴾ ''طٰ سٓ۔ یہ قرآن اور کتابِ مبین کی آیات ہیں۔''

اگر ''وَ'' کو واوِ تفسیری مانا جائے تو پھر ترجمہ ہو گا: ''یہ قرآن یعنی کتابِ مبین کی آیات ہیں۔''

آیت ۲ ﴿هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲﴾﴾ ''یہ ہدایت اور بشارت ہے اہلِ ایمان کے لیے۔''

آیت ۳ ﴿الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴿۳﴾﴾
''جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور وہی ہیں جو آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔''

یعنی آخرت پر ان کا پورا یقین ہے۔ سورۃ البقرۃ کے آغاز میں بھی متقین کی صفات کے ضمن میں عقیدۂ آخرت پر ایمان کے لیے لفظ ''يُوْقِنُوْنَ'' ہی استعمال ہوا ہے۔ دراصل انسان کے عمل اور کردار کے اچھے یا برے ہونے کا تعلق براہِ راست عقیدۂ آخرت کے ساتھ ہے۔ آخرت پر اگر یقین کامل نہیں ہے تو انسان کا عمل اور کردار بھی درست نہیں ہو سکتا۔

آیت ۴ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ﴾ ''یقیناً وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہم نے اُن کے لیے اُن کے اعمال کو مزین کر دیا ہے''

ایسے لوگوں کو اپنے غلط کام بھی اچھے لگتے ہیں اور اپنا کلچر ہی مثالی نظر آتا ہے۔

﴿فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۴﴾﴾ ''پس وہ بھٹکتے پھر رہے ہیں۔''

ع م ی کے مادہ میں بصارتِ ظاہری کے اندھے پن کا مفہوم ہے' جبکہ ع م ہ کے مادہ میں بصیرتِ باطنی کے اندھے پن کے معنی پائے جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی بصارت تو چاہے درست ہو مگر بصیرت ختم ہو چکی ہوتی ہے۔ انسان کی اس کیفیت کو سورۃ الحج میں یوں بیان فرمایا گیا ہے: ﴿فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ﴿۴۶﴾﴾ ''تو اصل میں آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں' بلکہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں کے اندر ہیں۔''

آیت ۵ ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْعَذَابِ وَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ﴿۵﴾﴾ ''یہی وہ لوگ ہیں کہ جن کے لیے بہت برا عذاب ہے اور یہی وہ

لوگ ہیں کہ جو آخرت میں سب سے زیادہ خسارے والے ہوں گے۔‘‘

آیت ۶ ﴿وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ ۝﴾ ’’اور (اے نبی ﷺ!) یقیناً آپ کو یہ قرآن دیا جا رہا ہے ایک حکیم اور علیم ہستی کی طرف سے۔‘‘

آیات ۷ تا ۱۴

اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِاَهْلِهٖٓ اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا ۭ سَاٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ اٰتِيْكُمْ
بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ۝ فَلَمَّا جَاۗءَهَا نُوْدِيَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِي
النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا ۭ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ يٰمُوْسٰٓى اِنَّهٗٓ اَنَا اللّٰهُ
الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ وَاَلْقِ عَصَاكَ ۭ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَاۗنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا
وَّلَمْ يُعَقِّبْ ۭ يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ ۣ اِنِّىْ لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ ۝ اِلَّا مَنْ
ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْۗءٍ فَاِنِّىْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَاَدْخِلْ يَدَكَ فِيْ
جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاۗءَ مِنْ غَيْرِ سُوْۗءٍ ۣ فِيْ تِسْعِ اٰيٰتٍ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهٖ ۭ
اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝ فَلَمَّا جَاۗءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ
مُّبِيْنٌ ۝ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ۭ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ
عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ۝

آیت ۷ ﴿اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِاَهْلِهٖٓ اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا ۭ﴾ ’’یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا اپنے گھر والوں سے کہ میں نے ایک آگ دیکھی ہے۔‘‘

﴿سَاٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ اٰتِيْكُمْ بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ۝﴾ ’’میں وہاں سے تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آؤں گا‘ یا کوئی دہکتا ہوا انگارہ لے آؤں گا تا کہ تم (آگ) تاپ سکو۔‘‘

عبارت کے انداز سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رات کا وقت تھا‘ سردی کا موسم تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک ایسے علاقے سے گزر رہے تھے جس سے انہیں کچھ واقفیت نہ تھی۔

آیت ۸ ﴿فَلَمَّا جَاۗءَهَا نُوْدِيَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا ۭ﴾ ’’پھر جب وہ

وہاں پہنچے تو انہیں پکارا گیا کہ بہت مبارک ہے وہ جو اس آگ میں ہے اور وہ جو اس کے آس پاس ہے۔‘‘

﴿وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ ’’اور پاک ہے اللہ جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔‘‘

آیت ۹ ﴿يٰمُوْسٰٓى اِنَّهٗٓ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝﴾ ’’اے موسیٰ! یہ تو میں ہوں‘ اللہ‘ بہت زبردست‘ کمال حکمت والا۔‘‘

میں اللہ ہوں اور میں ہی آپؑ سے اس وقت خطاب کر رہا ہوں۔

آیت ۱۰ ﴿وَاَلْقِ عَصَاكَ ۭ﴾ ’’اور اپنا عصا (زمین پر) ڈال دو۔‘‘

﴿فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَاۗنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ۭ﴾ ’’تو جب اُس نے اسے حرکت کرتے ہوئے دیکھا گویا وہ سانپ ہو تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگا اور پیچھے مُڑ کر بھی نہ دیکھا۔‘‘

یعنی آپؑ پر شدید خوف طاری ہو گیا۔

﴿يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ ۣ اِنِّىْ لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ ۝﴾ ’’(اللہ نے فرمایا:) اے موسیٰ! ڈرو نہیں‘ میرے حضور رسولوں کے لیے کوئی خوف نہیں ہوتا۔‘‘

آیت ۱۱ ﴿اِلَّا مَنْ ظَلَمَ﴾ ’’سوائے اُس کے جس نے کوئی ظلم کیا ہو‘‘

اس استثناء کو بعض مفسرین نے متّصل مانا ہے اور بعض نے منقطع۔ متصل ہونے کی صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ جس رسول سے کوئی قصور سرزد ہوا ہو اس پر خوف طاری ہو سکتا ہے۔ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اُس وقت خوف کا طاری ہو جانا اس خطا کے سبب تھا جو قتل (اگرچہ وہ قتلِ عمد نہیں تھا‘ قتلِ خطا تھا) کی صورت میں ان سے سرزد ہوئی تھی۔ لیکن اس کے برعکس کچھ مفسرین کے نزدیک یہ استثناء منقطع ہے‘ یعنی یہ الگ جملہ ہے اور اس کا پچھلے جملے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

﴿ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْۗءٍ فَاِنِّىْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾ ’’پھر اُس نے بدل دیا برائی کو نیکی سے‘ تو یقیناً میں بہت بخشنے والا‘ بے حد مہربان ہوں۔‘‘

آیت ۱۲ ﴿وَاَدْخِلْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاۗءَ مِنْ غَيْرِ سُوْۗءٍ ۣ﴾ ’’اور ذرا اپنا ہاتھ داخل کرو اپنے گریبان میں‘ وہ نکلے گا سفید چمکتا ہوا بغیر کسی مرض کے‘‘

یعنی یہ سفیدی برص یا کسی اور بیماری کے باعث نہیں ہوگی۔

﴿فِیۡ تِسۡعِ اٰیٰتٍ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ وَ قَوۡمِہٖ ؕ﴾ ’’یہ (دو نشانیاں) فرعون اور اُس کی قوم کے لیے نو نشانیوں میں سے ہیں۔‘‘

یعنی فرعون اور اس کی قوم کی طرف بھیجتے ہوئے ابھی آپؑ کو صرف یہ دو نشانیاں دی جا رہی ہیں‘ جبکہ کُل نو (۹) نشانیاں دی جانی مقصود ہیں۔ باقی نشانیاں بعد میں موقع محل اور ضرورت کے مطابق دی جائیں گی۔

﴿اِنَّہُمۡ کَانُوۡا قَوۡمًا فٰسِقِیۡنَ ﴿۱۲﴾﴾ ’’یقیناً وہ بڑے نافرمان لوگ ہیں۔‘‘

آیت ۱۳ ﴿فَلَمَّا جَآءَتۡہُمۡ اٰیٰتُنَا مُبۡصِرَۃً﴾ ’’تو جب اُن کے پاس ہماری آنکھیں کھول دینے والی نشانیاں آئیں‘‘

یعنی وہ کھلی کھلی نشانیاں جو ان کی آنکھیں کھولنے اور حقیقت کا مشاہدہ کرانے کے لیے کافی تھیں۔

﴿قَالُوۡا ہٰذَا سِحۡرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۱۳﴾﴾ ’’انہوں نے کہا کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔‘‘

آیت ۱۴ ﴿وَ جَحَدُوۡا بِہَا وَ اسۡتَیۡقَنَتۡہَاۤ اَنۡفُسُہُمۡ ظُلۡمًا وَّ عُلُوًّا ؕ﴾ ’’اور انہوں نے ان کا انکار کیا ظلم اور سرکشی کے ساتھ جبکہ ان کے دلوں نے ان کا یقین کیا۔‘‘

اس فقرے میں ظُلۡمًا وَّ عُلُوًّا کا تعلق آغاز کے لفظ وَجَحَدُوۡا کے ساتھ ہے۔ مضمون کے اعتبار سے یہ بہت اہم آیت ہے۔ اگرچہ انہوں نے بظاہر ان تمام نشانیوں کو جادو قرار دے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پیغمبر ماننے سے انکار کر دیا تھا لیکن ان کا یہ انکار سراسر ناانصافی اور سرکشی پر مبنی تھا‘ کیونکہ ان کے دل یہ حقیقت تسلیم کر چکے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام واقعی اللہ کے رسول ہیں اور یہ تمام خرقِ عادت واقعات حقیقت میں معجزات ہیں۔ ممکن ہے ان کے عوام کو یہ شعور نہ ہو لیکن کم از کم فرعون اور قوم کے بڑے بڑے سرداروں کی اُس وقت یہی کیفیت تھی۔

﴿فَانۡظُرۡ کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الۡمُفۡسِدِیۡنَ ﴿۱۴﴾﴾ ’’تو دیکھ لو! کیسا ہوا انجام مُفسِدوں کا۔‘‘

اس رکوع میں اجمالاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ تھا‘ اب اگلے رکوع سے حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کا ذکر شروع ہو رہا ہے۔

آیات ۱۵ تا ۴۴

وَ لَقَدۡ اٰتَیۡنَا دَاوٗدَ وَ سُلَیۡمٰنَ عِلۡمًا ۚ وَ قَالَا الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ فَضَّلَنَا عَلٰی کَثِیۡرٍ
مِّنۡ عِبَادِہِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۵﴾ وَ وَرِثَ سُلَیۡمٰنُ دَاوٗدَ وَ قَالَ یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ عُلِّمۡنَا
مَنۡطِقَ الطَّیۡرِ وَ اُوۡتِیۡنَا مِنۡ کُلِّ شَیۡءٍ ؕ اِنَّ ہٰذَا لَہُوَ الۡفَضۡلُ الۡمُبِیۡنُ ﴿۱۶﴾
وَ حُشِرَ لِسُلَیۡمٰنَ جُنُوۡدُہٗ مِنَ الۡجِنِّ وَ الۡاِنۡسِ وَ الطَّیۡرِ فَہُمۡ یُوۡزَعُوۡنَ ﴿۱۷﴾ حَتّٰۤی
اِذَاۤ اَتَوۡا عَلٰی وَادِ النَّمۡلِ ۙ قَالَتۡ نَمۡلَۃٌ یّٰۤاَیُّہَا النَّمۡلُ ادۡخُلُوۡا مَسٰکِنَکُمۡ ۚ لَا
یَحۡطِمَنَّکُمۡ سُلَیۡمٰنُ وَ جُنُوۡدُہٗ ۙ وَ ہُمۡ لَا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿۱۸﴾ فَتَبَسَّمَ ضَاحِکًا مِّنۡ
قَوۡلِہَا وَ قَالَ رَبِّ اَوۡزِعۡنِیۡۤ اَنۡ اَشۡکُرَ نِعۡمَتَکَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتَ عَلَیَّ وَ عَلٰی
وَالِدَیَّ وَ اَنۡ اَعۡمَلَ صَالِحًا تَرۡضٰىہُ وَ اَدۡخِلۡنِیۡ بِرَحۡمَتِکَ فِیۡ عِبَادِکَ
الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۱۹﴾ وَ تَفَقَّدَ الطَّیۡرَ فَقَالَ مَا لِیَ لَاۤ اَرَی الۡہُدۡہُدَ ۫ۖ اَمۡ کَانَ مِنَ
الۡغَآئِبِیۡنَ ﴿۲۰﴾ لَاُعَذِّبَنَّہٗ عَذَابًا شَدِیۡدًا اَوۡ لَاَاذۡبَحَنَّہٗۤ اَوۡ لَیَاۡتِیَنِّیۡ بِسُلۡطٰنٍ
مُّبِیۡنٍ ﴿۲۱﴾ فَمَکَثَ غَیۡرَ بَعِیۡدٍ فَقَالَ اَحَطۡتُّ بِمَا لَمۡ تُحِطۡ بِہٖ وَ جِئۡتُکَ مِنۡ سَبَاٍۭ
بِنَبَاٍ یَّقِیۡنٍ ﴿۲۲﴾ اِنِّیۡ وَجَدۡتُّ امۡرَاَۃً تَمۡلِکُہُمۡ وَ اُوۡتِیَتۡ مِنۡ کُلِّ شَیۡءٍ وَّ لَہَا
عَرۡشٌ عَظِیۡمٌ ﴿۲۳﴾ وَجَدۡتُّہَا وَ قَوۡمَہَا یَسۡجُدُوۡنَ لِلشَّمۡسِ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ وَ زَیَّنَ
لَہُمُ الشَّیۡطٰنُ اَعۡمَالَہُمۡ فَصَدَّہُمۡ عَنِ السَّبِیۡلِ فَہُمۡ لَا یَہۡتَدُوۡنَ ﴿ۙ۲۴﴾ اَلَّا
یَسۡجُدُوۡا لِلّٰہِ الَّذِیۡ یُخۡرِجُ الۡخَبۡءَ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ یَعۡلَمُ مَا تُخۡفُوۡنَ
وَ مَا تُعۡلِنُوۡنَ ﴿۲۵﴾ اَللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ رَبُّ الۡعَرۡشِ الۡعَظِیۡمِ ﴿۲۶﴾ قَالَ سَنَنۡظُرُ
اَصَدَقۡتَ اَمۡ کُنۡتَ مِنَ الۡکٰذِبِیۡنَ ﴿۲۷﴾ اِذۡہَبۡ بِّکِتٰبِیۡ ہٰذَا فَاَلۡقِہۡ اِلَیۡہِمۡ ثُمَّ
تَوَلَّ عَنۡہُمۡ فَانۡظُرۡ مَاذَا یَرۡجِعُوۡنَ ﴿۲۸﴾ قَالَتۡ یٰۤاَیُّہَا الۡمَلَؤُا اِنِّیۡۤ اُلۡقِیَ اِلَیَّ کِتٰبٌ
کَرِیۡمٌ ﴿۲۹﴾ اِنَّہٗ مِنۡ سُلَیۡمٰنَ وَ اِنَّہٗ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ﴿ۙ۳۰﴾ اَلَّا تَعۡلُوۡا عَلَیَّ
وَ اۡتُوۡنِیۡ مُسۡلِمِیۡنَ ﴿۳۱﴾ قَالَتۡ یٰۤاَیُّہَا الۡمَلَؤُا اَفۡتُوۡنِیۡ فِیۡۤ اَمۡرِیۡ ۚ مَا کُنۡتُ قَاطِعَۃً
اَمۡرًا حَتّٰی تَشۡہَدُوۡنِ ﴿۳۲﴾ قَالُوۡا نَحۡنُ اُولُوۡا قُوَّۃٍ وَّ اُولُوۡا بَاۡسٍ شَدِیۡدٍ ۬ۙ وَّ الۡاَمۡرُ
اِلَیۡکِ فَانۡظُرِیۡ مَاذَا تَاۡمُرِیۡنَ ﴿۳۳﴾ قَالَتۡ اِنَّ الۡمُلُوۡکَ اِذَا دَخَلُوۡا قَرۡیَۃً

اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿٣٤﴾ وَاِنِّيْ مُرْسِلَةٌ
اِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿٣٥﴾ فَلَمَّا جَآءَ سُلَيْمٰنَ قَالَ
اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ ۡ فَمَآ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّآ اٰتٰىكُمْ ۚ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ
تَفْرَحُوْنَ ﴿٣٦﴾ اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَآ
اَذِلَّةً وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿٣٧﴾ قَالَ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ
يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿٣٨﴾ قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ
مَّقَامِكَ ۚ وَاِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ ﴿٣٩﴾ قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ
اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ ۭ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ
هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ ڗ لِيَبْلُوَنِيْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ۭ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ
لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ ﴿٤٠﴾ قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ
اَتَهْتَدِيْٓ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِيْنَ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿٤١﴾ فَلَمَّا جَآءَتْ قِيْلَ اَهٰكَذَا
عَرْشُكِ ۭ قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ ۚ وَاُوْتِيْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِيْنَ ﴿٤٢﴾
وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿٤٣﴾
قِيْلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّكَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا ۭ
قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ ڛ قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَاَسْلَمْتُ
مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٤٤﴾ ۧ

آیت ۱۵ ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ﴾ ''اور ہم نے داؤدؑ اور سلیمانؑ کو علم عطا کیا تھا۔''

﴿وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٥﴾﴾ ''اور ان دونوں نے کہا کہ کُل شکر اور کُل تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں اپنے بہت سے مؤمن بندوں پر فضیلت عطا فرمائی۔''

وہ اللہ کا شکر ادا کرتے تھے کہ اللہ نے انہیں مؤمنین کے درمیان ایک خاص مرتبہ عطا کیا تھا۔

آیت ۱۶ ﴿وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ﴾ ''اور وارث ہوا سلیمانؑ داؤدؑ کا''

﴿وَقَالَ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ﴾ ''اور اُس نے کہا: اے لوگو! ہمیں سکھا دی گئی ہیں پرندوں کی بولیاں''

﴿وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ۭ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ﴿١٦﴾﴾ ''اور ہمیں (اللہ کی طرف سے) ہر چیز عطا کی گئی ہے۔ یقیناً یہ (اللہ کا) بہت واضح فضل ہے۔''

آیت ۱۷ ﴿وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿١٧﴾﴾ ''اور جمع کیے گئے سلیمان کے (معائنہ کے) لیے اُس کے تمام لشکر جنّوں، انسانوں اور پرندوں میں سے، اس طرح کہ انہیں جماعتوں میں منظّم کیا جاتا تھا۔''

ہر قسم اور ہر جنس کے لشکر کی علیحدہ علیحدہ جماعتیں (battalians) بنا کر انہیں ہر طرح سے منظّم کیا گیا تھا۔

آیت ۱۸ ﴿حَتّٰٓى اِذَآ اَتَوْا عَلٰي وَادِ النَّمْلِ ۙ﴾ ''یہاں تک کہ جب وہ چیونٹیوں کی وادی میں پہنچے''

حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے لشکروں کے ساتھ سفر کرتے ہوئے ایک ایسے علاقے سے گزرے جہاں چیونٹیاں کثرت سے پائی جاتی تھیں۔

﴿قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ﴾ ''تو ایک چیونٹی نے کہا: اے چیونٹیو! تم سب اپنے بلوں میں گھس جاؤ۔''

﴿لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿١٨﴾﴾ ''کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمانؑ اور اُس کے لشکر تمہیں کچل کر رکھ دیں اور انہیں اس کا احساس بھی نہ ہو۔''

انہیں احساس بھی نہیں ہو گا کہ ان کے قدموں اور گھوڑوں کے سموں تلے کتنی ننھی جانیں مسلی جا رہی ہیں۔

آیت ۱۹ ﴿فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا﴾ ''تو وہ خوش ہو کر مسکرایا اس کی اس بات پر''

حضرت سلیمان علیہ السلام نے چیونٹی کی اس بات کو سن بھی لیا اور سمجھ بھی لیا۔ چنانچہ جذباتِ تشکّر کے باعث آپؑ کے چہرے پر بے اختیار تبسم آ گیا اور زبان پر ترانۂ حمد جاری ہو گیا۔

﴿وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰي وَالِدَيَّ﴾ ''اور اُس نے کہا: اے میرے پروردگار! مجھے توفیق دے کہ میں شکر ادا کروں تیری اس

نعمت کا جو تو نے مجھے اور میرے والدین کو عطا کی ہے‘‘

﴿وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِكَ فِیْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۹﴾﴾ ’’اور یہ کہ میں اچھے اعمال کروں جن سے تو راضی ہو‘ اور مجھے داخل کرنا اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں۔‘‘

آیت ۲۰ ﴿وَتَفَقَّدَ الطَّیْرَ فَقَالَ مَا لِیَ لَآ اَرَی الْهُدْهُدَ ۫ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِیْنَ ﴿۲۰﴾﴾ ’’اور اُس نے پرندوں کے لشکر کا معائنہ کیا تو کہا کہ کیا بات ہے مجھے ہُد ہُد نظر نہیں آ رہا؟ کیا وہ غیر حاضر ہے؟‘‘

آیت ۲۱ ﴿لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِیْدًا اَوْ لَاَاذْبَحَنَّهٗٓ﴾ ’’میں اُسے بہت سخت سزا دوں گا‘ یا اُسے ذبح کر ڈالوں گا‘‘

اس اجتماعی حاضری (parade) کے موقع سے غیر حاضر ہو کر اس نے بہت بڑا جرم کیا ہے اور اسے اس جرم کی سزا ضرور بھگتنا ہو گی۔

﴿اَوْ لَیَاْتِیَنِّیْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ﴿۲۱﴾﴾ ’’یا وہ میرے پاس کوئی واضح دلیل لے کر آئے۔‘‘

ہاں اگر وہ کوئی ٹھوس عذر پیش کر کے اپنی اس غیر حاضری کا جواز ثابت کر دے تو سزا سے بچ سکتا ہے۔

آیت ۲۲ ﴿فَمَكَثَ غَیْرَ بَعِیْدٍ﴾ ’’تو کچھ زیادہ دیر نہیں گزری (کہ ہُد ہُد پہنچ گیا)‘‘

﴿فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍۭ بِنَبَاٍ یَّقِیْنٍ ﴿۲۲﴾﴾ ’’تو اُس نے کہا کہ میں نے وہ کچھ معلوم کیا ہے جو آپ کو معلوم نہیں‘ اور میں آپؑ کے پاس قومِ سبا سے متعلق یقینی معلومات لے کر آیا ہوں۔‘‘

قومِ سبا یمن کے علاقے میں آباد تھی اور اُس وقت بلقیس نامی ایک ملکہ اس قوم پر حکمران تھی۔

آیت ۲۳ ﴿اِنِّیْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ وَاُوْتِیَتْ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ﴾ ’’میں نے ایک عورت کو ان پر حکومت کرتے ہوئے دیکھا ہے اور اُسے ہر شے دی گئی ہے‘‘

دنیا بھر کی نعمتیں اسے حاصل ہیں اور ہر طرح کا ساز و سامان اس کے پاس جمع ہے۔

﴿وَّلَهَا عَرْشٌ عَظِیْمٌ ﴿۲۳﴾﴾ ’’اور اُس کا تخت بہت عظیم الشان ہے۔‘‘

آیت ۲۴ ﴿وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا یَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ ’’اور میں نے دیکھا اُس کو اور اُس کی قوم کو کہ وہ سجدہ کرتے ہیں سورج کو اللہ کو چھوڑ کر‘‘

﴿وَزَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ﴾ ’’اور شیطان نے اُن کے لیے اُن کے اعمال کو مزین کر دیا ہے‘‘

﴿فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِیْلِ فَهُمْ لَا یَهْتَدُوْنَ ﴿۲۴﴾﴾ ’’اور انہیں روک دیا ہے سیدھے راستے سے‘ تو اب وہ راستہ نہیں پا رہے۔‘‘

شیطان نے انہیں گمراہ کر دیا ہے اور اب انہیں راہِ ہدایت کا شعور نہیں رہا۔

آیت ۲۵ ﴿اَلَّا یَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ یُخْرِجُ الْخَبْءَ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَیَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ﴿۲۵﴾﴾ ’’کہ وہ سجدہ نہیں کرتے اللہ کو‘ جو نکالتا ہے ہر چھپی چیز کو آسمانوں اور زمین میں سے اور وہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم چھپاتے ہو اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو۔‘‘

آیت ۲۶ ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ ﴿۲۶﴾﴾ ’’وہ اللہ کہ جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور جو بہت بڑے عرش کا مالک ہے۔‘‘

آیت ۲۷ ﴿قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ ﴿۲۷﴾﴾ ’’سلیمانؑ نے کہا: ہم عنقریب دیکھیں گے کہ تم نے سچ کہا ہے یا تم جھوٹے ہو۔‘‘

ہم معلوم کر لیں گے کہ واقعی تم ایک سچی خبر لے کر آئے ہو یا اپنی غیر حاضری کی سزا سے بچنے کے لیے جھوٹا بہانہ بنا رہے ہو۔

آیت ۲۸ ﴿اِذْهَبْ بِّكِتٰبِیْ هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَیْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا یَرْجِعُوْنَ ﴿۲۸﴾﴾ ’’میرا یہ خط لے جاؤ‘ اسے ان کے پاس جا کر ڈال آؤ‘ پھر ان سے الگ ہو کر دیکھتے رہو کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں۔‘‘

چنانچہ وہ ہُد ہُد حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط لے گیا اور جا کر ملکہ کے آس پاس یا شاید اس کی خواب گاہ میں پھینک دیا۔ ملکہ نے یہ غیر معمولی خط پڑھا تو فوری طور پر قوم کے بڑے بڑے سرداروں کو مشورے کے لیے دربار میں طلب کر لیا۔

آیت ۲۹ ﴿قَالَتۡ یٰۤاَیُّهَا الۡمَلَؤُا اِنِّیۡۤ اُلۡقِیَ اِلَیَّ کِتٰبٌ کَرِیۡمٌ ﴿۲۹﴾﴾ ’’اُس نے کہا کہ اے (میری قوم کے) سردارو! میری طرف ایک بہت عزّت والا خط ڈالا گیا ہے۔‘‘

آیت ۳۰ ﴿اِنَّهٗ مِنۡ سُلَیۡمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ﴿۳۰﴾﴾ ’’یہ (خط) سلیمان کی طرف سے ہے اور اس کا آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہوا ہے۔‘‘

یہ قرآن کا واحد مقام ہے جہاں ’’بسم اللہ الرحمٰن الرحیم‘‘ سورت کے اندر اس کے متن میں شامل ہے۔ باقی ہر جگہ یہ سورتوں کے آغاز میں لکھی گئی ہے۔ اس کے بارے میں اختلاف ہے کہ سورتوں کے آغاز میں جہاں جہاں بھی بسم اللہ لکھی گئی ہے کیا اسے ایک آیت مانا جائے گا یا جتنی مرتبہ لکھی گئی ہے اتنی آیات شمار ہوں گی۔

آیت ۳۱ ﴿اَلَّا تَعۡلُوۡا عَلَیَّ وَاۡتُوۡنِیۡ مُسۡلِمِیۡنَ ﴿۳۱﴾﴾ ’’یہ کہ میرے مقابلے میں تم لوگ سرکشی نہ کرو اور مطیع ہو کر میرے پاس حاضر ہو جاؤ۔‘‘

آیت ۳۲ ﴿قَالَتۡ یٰۤاَیُّهَا الۡمَلَؤُا اَفۡتُوۡنِیۡ فِیۡۤ اَمۡرِیۡ ۚ مَا کُنۡتُ قَاطِعَةً اَمۡرًا حَتّٰی تَشۡهَدُوۡنِ ﴿۳۲﴾﴾ ’’اُس نے کہا: اے سردارو! میرے اس معاملے میں آپ لوگ مجھے مشورہ دیں۔ میں کسی معاملے میں بھی حتمی فیصلہ نہیں کرتی جب تک آپ لوگ موجود نہ ہوں۔‘‘

آیت ۳۳ ﴿قَالُوۡا نَحۡنُ اُولُوۡا قُوَّةٍ وَّاُولُوۡا بَاۡسٍ شَدِیۡدٍ ۬﴾ ’’انہوں نے کہا: ہم طاقتور بھی ہیں اور زبردست جنگی صلاحیت والے بھی‘‘

﴿وَّالۡاَمۡرُ اِلَیۡكِ فَانۡظُرِیۡ مَاذَا تَاۡمُرِیۡنَ ﴿۳۳﴾﴾ ’’اور فیصلے کا اختیار تو آپ ہی کے پاس ہے‘ چنانچہ آپ خود دیکھ لیں کہ کیا حکم دیتی ہیں۔‘‘

آیت ۳۴ ﴿قَالَتۡ اِنَّ الۡمُلُوۡكَ اِذَا دَخَلُوۡا قَرۡیَةً اَفۡسَدُوۡهَا﴾ ’’اُس نے کہا کہ بادشاہ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اس میں فساد برپا کر دیتے ہیں‘‘

اس نازک موقع پر ملکہ نے بڑی دانش مندانہ بات کی کہ بادشاہوں کا ہمیشہ سے ہی دستور رہا ہے کہ وہ جس شہر یا علاقے کو فتح کرتے ہیں اسے برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔

﴿وَجَعَلُوۡۤا اَعِزَّةَ اَهۡلِهَاۤ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ یَفۡعَلُوۡنَ ﴿۳۴﴾﴾ ’’اور اس کے معزز لوگوں

کو ذلیل کر دیتے ہیں‘ اور وہ ایسے ہی کرتے ہیں۔‘‘

ملکہ کی یہ بات بھی بہت اہم اور حقیقت پر مبنی ہے۔ علامہ اقبالؔ نے اپنی نظم ’’خضرِ راہ‘‘ کے ذیلی عنوان ’’سلطنت‘‘ کے تحت جو فلسفہ بیان کیا ہے اس کا مرکزی خیال انہوں نے اسی آیت سے اخذ کیا ہے اور پہلے شعر میں اس آیت سے تلمیح بھی استعمال کی ہے۔ نظم کا آغاز یوں ہوتا ہے: ؎

آ بتاؤں تجھ کو رَمزِ آیۂ اِنَّ الۡمُلُوۡك
سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اُس کو حکمراں کی ساحری!

برعظیم پاک و ہند میں مسلمانوں کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا۔ یہاں مسلمان حکمران تھے جبکہ ہندو ان کے محکوم تھے۔ انگریزوں کے اقتدار پر قبضہ کرنے سے ہندوؤں کو تو کچھ خاص فرق نہ پڑا‘ ان کے تو صرف حکمران تبدیل ہوئے‘ پہلے وہ مسلمانوں کے غلام تھے‘ اب انگریزوں کے غلام بن گئے‘ لیکن مسلمان تو گویا آسمان سے زمین پر پٹخ دیے گئے۔ وہ حاکم سے محکوم بن گئے۔ اب اگر انگریزوں کو کچھ خطرہ تھا تو مسلمانوں سے تھا۔ انہیں خدشہ تھا کہ مسلمان اپنا کھویا ہوا اقتدار دوبارہ حاصل کرنے کے لیے ضرور کوشش کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کی ممکنہ بغاوت کی پیش بندی کے لیے انہیں ہر طرح سے دبانے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں انہوں نے یہ طریقہ اپنایا کہ معاشرے کے گھٹیا لوگوں کو تو خطابات اور جاگیروں سے نواز کر اعلیٰ مناصب پر بٹھا دیا اور ان کے مقابلے میں معززین اور شرفاء کو ہر طرح سے ذلیل و رسوا کیا۔ ایسے تمام جاگیردار انگریزوں کا حقِ نمک ادا کرتے ہوئے اپنی قوم کے مفادات کے خلاف اپنے آقاؤں کی معاونت میں ہمیشہ پیش پیش رہتے۔

یہی حکمتِ عملی مصر میں فرعون نے بھی اپنا رکھی تھی۔ اس نے بھی بنی اسرائیل میں سے کچھ لوگوں کو اپنے دربار میں جگہ دے رکھی تھی۔ یہ مراعات یافتہ لوگ فرعون کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنی قوم کی مخبری کرتے اور اپنے ہی بھائی بندوں کے خلاف فرعون کے معاون و مددگار بنتے۔ سورۂ یونس کی آیت ۸۳ میں اس صورتِ حال کو اس طرح بیان فرمایا گیا ہے:

﴿فَمَاۤ اٰمَنَ لِمُوۡسٰۤی اِلَّا ذُرِّیَّةٌ مِّنۡ قَوۡمِهٖ عَلٰی خَوۡفٍ مِّنۡ فِرۡعَوۡنَ وَمَلَا۠ئِهِمۡ اَنۡ

یَفۡتِنَہُمۡ ؕ﴾ ''پس نہیں ایمان لائے موسیٰ پر مگر کچھ نوجوان اُس کی قوم میں سے‘ فرعون اور اپنے سرداروں کے خوف کی وجہ سے کہ وہ انہیں کسی مصیبت میں مبتلا نہ کر دیں''۔ گویا بنی اسرائیل کے عام لوگوں پر اپنے ان سرداروں کا خوف طاری تھا جو فرعون کی وفاداری میں اپنی ہی قوم پر ظلم وستم روا رکھتے تھے۔

آیت ۳۵ ﴿وَ اِنِّیۡ مُرۡسِلَۃٌ اِلَیۡہِمۡ بِہَدِیَّۃٍ فَنٰظِرَۃٌۢ بِمَ یَرۡجِعُ الۡمُرۡسَلُوۡنَ ﴿۳۵﴾﴾ ''تو میں ان کی طرف اپنے ایلچی کچھ تحائف کے ساتھ بھیجتی ہوں‘ پھر دیکھتی ہوں کہ وہ کیا جواب لے کر واپس آتے ہیں۔''

حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں قیمتی تحائف بھیج کر وہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ آیا دنیوی مال و دولت کا حصول ہی ان کا مقصد و مدعا ہے یا اس سے آگے بڑھ کر وہ کچھ اور چاہتے ہیں۔

آیت ۳۶ ﴿فَلَمَّا جَآءَ سُلَیۡمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوۡنَنِ بِمَالٍ ۫ فَمَاۤ اٰتٰىنِۦَ اللّٰہُ خَیۡرٌ مِّمَّاۤ اٰتٰىکُمۡ ۚ﴾ ''تو جب وہ (وفد) آیا سلیمان کے پاس‘ اُس نے کہا کہ کیا تم میری اعانت کرنا چاہتے ہو مال و دولت سے؟ تو جو کچھ مجھے اللہ نے دے رکھا ہے وہ کہیں بہتر ہے اُس سے جو اُس نے تمہیں دیا ہے۔''

﴿بَلۡ اَنۡتُمۡ بِہَدِیَّتِکُمۡ تَفۡرَحُوۡنَ ﴿۳۶﴾﴾ ''اپنے ان تحائف سے تم خود ہی خوش رہو۔''

آیت ۳۷ ﴿اِرۡجِعۡ اِلَیۡہِمۡ فَلَنَاۡتِیَنَّہُمۡ بِجُنُوۡدٍ لَّا قِبَلَ لَہُمۡ بِہَا وَ لَنُخۡرِجَنَّہُمۡ مِّنۡہَاۤ اَذِلَّۃً وَّ ہُمۡ صٰغِرُوۡنَ ﴿۳۷﴾﴾ ''تم لوٹ جاؤ ان کی طرف‘ تو ہم ان پر ایسے لشکروں سے حملہ آور ہوں گے جن کا مقابلہ ان کے لیے ممکن نہیں ہوگا‘ اور ہم نکال باہر کریں گے انہیں اس ملک سے ذلیل کر کے اور وہ خوار ہو جائیں گے۔''

یعنی انہیں یا تو ہماری پہلی بات ماننا پڑے گی کہ وہ مسلم (مطیع) ہو کر ہمارے پاس حاضر ہو جائیں‘ ورنہ ہم ان پر لشکر کشی کریں گے۔

آیت ۳۸ ﴿قَالَ یٰۤاَیُّہَا الۡمَلَؤُا اَیُّکُمۡ یَاۡتِیۡنِیۡ بِعَرۡشِہَا قَبۡلَ اَنۡ یَّاۡتُوۡنِیۡ مُسۡلِمِیۡنَ ﴿۳۸﴾﴾ ''(پھر اپنے درباریوں سے مخاطب ہو کر) سلیمان نے کہا: اے درباریو! تم میں سے کون اس (ملکہ) کا تخت میرے پاس لائے گا اس سے پہلے کہ وہ لوگ فرمانبردار ہو کر

میرے پاس پہنچیں؟''

یعنی آپؑ کو یقین تھا کہ ملکہ سبا اظہارِ اطاعت کے لیے ضرور حاضر ہوگی۔ چنانچہ آپؑ نے چاہا کہ اس کے آنے سے پہلے اس کا تخت یہاں پہنچ جائے اور اس میں تھوڑی بہت تبدیلی کر کے اس کی آزمائش کی جائے کہ وہ اپنے تخت کو پہچان پاتی ہے یا نہیں۔

آیت ۳۹ ﴿قَالَ عِفۡرِیۡتٌ مِّنَ الۡجِنِّ اَنَا اٰتِیۡکَ بِہٖ قَبۡلَ اَنۡ تَقُوۡمَ مِنۡ مَّقَامِکَ ۚ وَ اِنِّیۡ عَلَیۡہِ لَقَوِیٌّ اَمِیۡنٌ ﴿۳۹﴾﴾ ''جنوں میں سے ایک دیو نے کہا کہ میں اسے آپ کے پاس لے آتا ہوں اس سے پہلے کہ آپؑ اپنی اس مجلس سے اٹھیں‘ اور میں یقیناً اس کام کے لیے طاقت بھی رکھتا ہوں اور امانت دار بھی ہوں۔''

جس طرح انسانوں میں کوئی کمزور ہوتا ہے اور کوئی طاقتور‘ اسی طرح جنوں میں بھی چھوٹے بڑے جن ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک طاقتور قوی ہیکل دیو نے دعویٰ کیا کہ آپؑ کے دربار برخواست کرنے سے پہلے میں وہ تخت لا کر آپؑ کی خدمت میں حاضر کیے دیتا ہوں۔

آیت ۴۰ ﴿قَالَ الَّذِیۡ عِنۡدَہٗ عِلۡمٌ مِّنَ الۡکِتٰبِ اَنَا اٰتِیۡکَ بِہٖ قَبۡلَ اَنۡ یَّرۡتَدَّ اِلَیۡکَ طَرۡفُکَ ؕ﴾ ''کہنے لگا وہ شخص جس کے پاس کتاب کا علم تھا کہ میں اسے آپ کے پاس لے آتا ہوں اس سے قبل کہ آپؑ کی نگاہ پلٹ کر آپؑ کی طرف آئے۔''

یعنی میں آپؑ کے پلک جھپکنے سے پہلے اس کو حاضر کیے دیتا ہوں۔ یہ جس شخص کا ذکر ہے اس کے بارے میں مفسرین کہتے ہیں کہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے وزیر آصف بن برخیاہ تھے‘ اور یہ کہ ان کے پاس کتبِ سماویہ اور اللہ تعالیٰ کے ناموں سے متعلق ایک خاص علم تھا جس کی تاثیر سے انہوں نے اس کام کو ممکن کر دکھایا۔ ہمارے پاس اس موضوع پر نہ تو کوئی مرفوع حدیث ہے اور نہ ہی ان اسمائے الٰہیہ میں ایسی کوئی تاثیر ثابت ہوتی ہے جو ہمیں حضور ﷺ کی طرف سے بتائے گئے ہیں۔ لہٰذا ہمارا ایمان ہے کہ قرآن میں یہ واقعہ جس طرح مذکور ہے بالکل ویسے ہی وقوع پذیر ہوا ہوگا۔ لیکن ساتھ ہی ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اگر اس کی تفصیلات میں دلچسپی لینا ہمارے لیے مفید ہوتا تو حضور ﷺ لازماً وضاحت فرما دیتے کہ اس شخصیت کے پاس کس کتاب کا کون سا علم تھا۔ اور اگر آپؐ کی طرف سے ایسی کچھ ہدایات نہیں دی گئیں تو اس کا مطلب یہی ہے کہ ہمیں اس بارے میں مزید کسی کھوج کرید میں نہیں پڑنا چاہیے۔ چنانچہ اس

اعتبار سے یہ آیت متشابہات میں سے ہے۔

البتہ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ کے الفاظ میں سائنسی اور ٹیکنیکل علم کی طرف بھی اشارہ موجود ہے۔ ہوسکتا ہے انہیں کوئی ایسی ترکیب معلوم ہو جس کے ذریعے سے سائنسی طور پر ایسا کرنا ممکن ہوا ہو۔ بہرحال سائنسی نقطہ نظر سے ایسا ہونا کوئی ناممکن بات بھی نہیں ہے۔ آج سائنس جس انداز اور جس رفتار سے ترقی کر رہی ہے اس کے نتیجے میں ممکن ہے بہت جلد ایسی ٹیکنالوجی حاصل کر لی جائے جس کے ذریعے سے کسی مادی چیز کو atoms میں تحلیل کرنا اور پھر ان atoms کو چشم زدن میں دوسری جگہ منتقل کر کے ان سے اس چیز کو اسی حالت میں دوبارہ ٹھوس شکل دے دینا ممکن ہو جائے۔

﴿فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ﴾ ''پھر جب اُس نے دیکھا اسے اپنے سامنے رکھا ہوا''

یعنی وہ صاحب اپنے دعوے کے مطابق اس تخت کو واقعی پلک جھپکنے سے پہلے لے آئے اور جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسے اپنے سامنے دیکھا تو بے اختیار آپ اللہ کی حمد و ثنا کرنے لگے۔

﴿قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ﴾ ''اُس نے کہا کہ یہ میرے رب ہی کے فضل سے ہے''

کوئی دنیا دار بادشاہ ہوتا تو اپنے وزیر کے کمال کو بھی اپنا ہی کمال قرار دیتا' لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسے اللہ کا فضل قرار دیا اور اس کا شکر ادا کیا۔ بندگی کا کامل نمونہ بھی یہی ہے کہ انسان بڑی سے بڑی کامیابی کو اپنا کمال سمجھنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کا انعام جانے اور اس پر اس کا شکر ادا کرے۔

﴿لِيَبْلُوَنِيْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ﴾ ''تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ کیا میں شکر ادا کرتا ہوں یا ناشکری کرتا ہوں۔''

﴿وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ﴾ ''اور جو کوئی شکر کرتا ہے وہ اپنے ہی (بھلے کے) لیے کرتا ہے۔''

﴿وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ ۝۴۰﴾ ''اور جو کوئی ناشکری کرتا ہے تو میرا رب یقیناً بے نیاز ہے' بہت کرم کرنے والا۔''

آیت ۴۱ ﴿قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا﴾ ''سلیمانؑ نے کہا کہ اس کے لیے اس کے تخت کی ہیئت ذرا بدل دو''

کہ ملکہ کو آزمانے کے لیے تخت کی ظاہری ہیئت میں تھوڑی بہت تبدیلی کر دو۔

﴿نَنْظُرْ اَتَهْتَدِيْٓ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِيْنَ لَا يَهْتَدُوْنَ ۝۴۱﴾ ''ہم دیکھیں کہ وہ پہچان پاتی ہے یا ان لوگوں میں سے ہوتی ہے جو نہیں پہچان پاتے۔''

آیت ۴۲ ﴿فَلَمَّا جَاۗءَتْ قِيْلَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ ۭ قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ﴾ ''پھر جب وہ آئی تو (اس سے) کہا گیا کہ کیا اسی طرح کا ہے آپ کا تخت؟ اُس نے کہا یہ تو گویا وہی ہے!''

چنانچہ اس نے اپنے تخت کو پہچان لیا۔ یعنی وہ واقعی ایک ذہین اور سمجھ دار عورت تھی۔ اس سے پہلے آیت ۳۴ میں فاتح بادشاہوں کے بارے میں اس کا تبصرہ بھی اس کی ذہانت اور دانش مندی کا ثبوت ہے۔

﴿وَاُوْتِيْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِيْنَ ۝۴۲﴾ ''اور ہمیں اس سے پہلے ہی علم حاصل ہو چکا ہے اور ہم اسلام لا چکے ہیں۔''

یعنی میرے تخت کا یہاں پہنچ جانا اب میرے لیے کوئی بہت بڑی حیرت کی بات نہیں۔ آپؑ کا اللہ کے ہاں جو مقام و مرتبہ ہے اس کے بارے میں مجھے بہت پہلے ہی علم ہو چکا ہے اور اسی وجہ سے ہم مسلمان ہو کر آپؑ کی اطاعت قبول کر چکے ہیں۔

آیت ۴۳ ﴿وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ ''اور سلیمانؑ نے اُسے روک دیا (اس سے) جس کو وہ پوجتی تھی اللہ کے سوا۔''

﴿اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ۝۴۳﴾ ''وہ ایک کافر قوم میں سے تھی۔''

آیت ۴۴ ﴿قِيْلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ﴾ ''اُس سے کہا گیا کہ اب محل میں داخل ہو جاؤ!''

﴿فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّكَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا﴾ ''تو جب اُس نے اس (کے فرش) کو دیکھا تو اسے گہرا پانی سمجھا اور اپنی دونوں پنڈلیاں کھول دیں۔''

﴿قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ﴾ ''سلیمانؑ نے کہا: یہ تو ایسا محل ہے جو مرصع ہے شیشوں سے۔''

(باقی صفحہ 84 پر)

اصلاحِ معاشرہ کا قرآنی تصور

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ

کا ۲۹/اکتوبر ۱۹۸۲ء کا خطابِ جمعہ

> بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے مسجد دار السلام باغ جناح لاہور میں ۲۹/اکتوبر اور ۵/نومبر ۱۹۸۲ء کے خطاباتِ جمعہ میں ''اصلاحِ معاشرہ کا قرآنی تصور'' کے موضوع پر خطابات فرمائے تھے۔
>
> مزید برآں ۱۲/نومبر ۱۹۸۲ء کو جناح ہال لاہور میں مرکزی انجمن خُدّام القرآن لاہور کی تاسیس کی دس سالہ تقاریب کے افتتاحی اجلاس کے موقع پر ''اصلاحِ معاشرہ کا انقلابی تصور'' کے موضوع پر نہایت مفصل خطاب فرمایا۔ ان تینوں خطابات کو شیخ جمیل الرحمٰن مرحوم نے کیسٹ سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر کے ترتیب و تسوید کے بعد بالاقساط میثاق کے صفحات کی زینت بنایا۔ موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر ان خطابات کو نظرثانی کے بعد بارِ دگر ہدیۂ قارئین کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اعوذ باللّٰہ من الشّیطٰن الرّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی فِیۡ سُوۡرَۃِ الۡبَقَرَۃِ :

﴿وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ؕ﴾ (آیت ۱۶۵)

وَقَالَ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ فِیۡ سُوۡرَۃِ التَّوۡبَۃِ:

﴿قُلۡ اِنۡ کَانَ اٰبَآؤُکُمۡ وَاَبۡنَآؤُکُمۡ وَاِخۡوَانُکُمۡ وَاَزۡوَاجُکُمۡ وَعَشِیۡرَتُکُمۡ وَاَمۡوَالُۨ اقۡتَرَفۡتُمُوۡهَا وَتِجَارَۃٌ تَخۡشَوۡنَ کَسَادَهَا وَمَسٰکِنُ تَرۡضَوۡنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَیۡکُمۡ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوۡلِهٖ وَجِهَادٍ فِیۡ سَبِیۡلِهٖ فَتَرَبَّصُوۡا حَتّٰی یَاۡتِیَ اللّٰہُ بِاَمۡرِهٖ ؕ وَاللّٰہُ لَا یَهۡدِی الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِیۡنَ ﴿۲۴﴾﴾

وَقَالَ اللّٰہُ سُبۡحَانَهٗ وَتَعَالٰی فِیۡ سُوۡرَۃِ الۡعَلَقِ :

﴿کَلَّاۤ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَیَطۡغٰۤی ۙ﴿۶﴾ اَنۡ رَّاٰهُ اسۡتَغۡنٰی ؕ﴿۷﴾ اِنَّ اِلٰی رَبِّکَ الرُّجۡعٰی ؕ﴿۸﴾﴾

صَدَقَ اللّٰہُ مَوۡلَانَا الۡعَظِیۡمُ

رَبِّ اشۡرَحۡ لِیۡ صَدۡرِیۡ وَیَسِّرۡ لِیۡۤ اَمۡرِیۡ وَاحۡلُلۡ عُقۡدَۃً مِّنۡ لِّسَانِیۡ یَفۡقَهُوۡا قَوۡلِیۡ، اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اَلۡهِمۡنَا رُشۡدَنَا وَاَعِذۡنَا مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا، اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الۡحَقَّ حَقًّا وَّارۡزُقۡنَا اتِّبَاعَهٗ وَاَرِنَا الۡبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارۡزُقۡنَا اجۡتِنَابَهٗ، اٰمِیۡنَ یَا رَبَّ الۡعَالَمِیۡنَ ۝

اصلاحِ معاشرہ کی جڑ اور چوٹی

حضرات! آپ کے علم میں ہے کہ اس وقت ہمارے ملک میں سرکاری اور نیم سرکاری دونوں سطحوں پر اصلاحِ معاشرہ کی مہم جاری ہے۔ اس سے قطع نظر کہ یہ مہم اکثر و بیشتر صرف کاغذی ہے، یہ چند محافل و مجالس میں تقریروں کے موضوع کی شکل میں اور پھر اخبارات میں خبروں کی صورت میں نظر آتی ہے، اس معاملے کا اہم ترین پہلو یہ ہے کہ اس مہم کا نہ کوئی سر ہے نہ پیر۔ میں یہ الفاظ جان بوجھ کر استعمال کر رہا ہوں۔ سر سے میری مراد کیا ہے اور پیر سے میری مراد کیا ہے اور ان دونوں کا اس مہم میں موجود نہ ہونا میرے نزدیک کیا معنی رکھتا ہے؟ آج اسی ضمن میں مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ اصلاحِ معاشرہ کا پیر یا اس کی جڑ اور اساس 'تعمیرِ کردار' ہے۔ افراد کی شخصیتوں کی تعمیر کے لیے جو مثبت اساس ضروری ہے اگر وہ فراہم نہ کی جا رہی ہو، اس پر توجہ نہ دی جا رہی ہو، اس پر نگاہیں مرکوز نہ ہو رہی ہوں تو ظاہر بات ہے کہ مہم چاہے کتنے ہی جوش و خروش سے اُٹھائی گئی ہو اور لوگ اس ضمن میں کتنی ہی توانائی اور کتنا ہی وقت صرف کر رہے ہوں، ایسی تمام کوششیں بالکل بے بنیاد ہیں اور ان کی کوئی جڑ اور اساس نہیں ہے۔ سر کے مفہوم میں جو بات میرے پیشِ نظر ہے، وہ یہ ہے کہ کسی معاشرے میں اگر نظامِ صالح اور عادلانہ نہ ہو اور اس وجہ سے لوگوں میں سکون و اطمینانِ قلب کی کیفیات اور تعمیری و مثبت احساسات و جذبات پیدا ہونے کے بجائے نفرت، بغض، عداوت اور انتقام کے جذبات پرورش پا رہے ہوں تو اس نظام میں اصلاحِ معاشرہ کی کسی مہم اور کوشش کے کامیاب ہونے کا کوئی امکان سرے سے موجود نہیں ہوتا۔

میرے نزدیک اصلاحِ معاشرہ کی جڑ اور بنیاد ہے تعمیرِ سیرت و کردار کی مثبت کوشش، اور

اس کی چوٹی یہ ہے کہ معاشرے میں جو نظام قائم ہو وہ عادلانہ ہو اور مبنی بر قسط و انصاف ہو۔ اس میں اطمینان و سکون کی کیفیات موجود ہوں اور اس نظام کے تحت زندگی گزارنے والوں کے اذہان و قلوب انتقامی اور نفرت و عداوت کے منفی جذبات سے نہ صرف پاک ہوں بلکہ ان جذبات کے بجائے ان میں تعمیری و مثبت احساسات جاگزین ہوں۔ ان دونوں کے مابین ایک درمیانی سطح ہے جس کے پیش نظر کچھ نہ کچھ کرنے کی کوشش ہو رہی ہے‘ اور وہ ہے اوامر ونواہی کا ایک نظام اور تعزیر و تادیب اور احتساب کا ایک قانونی سلسلہ۔ یہ کام بھی یقیناً اصلاحِ معاشرہ میں مدد ہوتا ہے اور اس کی بھی ضرورت ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ درمیانی شے ہے‘ اور جب تک تعمیر کردار کی تعمیری و مثبت کوشش نہ ہو اور جب تک معاشرے میں ایک عادلانہ نظام قائم نہ کیا جائے‘ اُس وقت تک محض یہ دارو گیر‘ تعزیر و تادیب‘ احتساب اور اوامر و نواہی کے صرف نعروں اور slogans سے پیش نظر اصل مقصود حاصل نہیں ہو سکتا۔

اصلاحِ معاشرہ کے لیے میں نے جن امور کو سر اور پیر سے تعبیر کیا ہے یا جن کو چوٹی اور بنیاد قرار دیا ہے‘ اس کو اجمالی طور پر تو میں نے بیان کر دیا ہے‘ لیکن اس اجمال سے یہ مسئلہ پوری طرح واضح نہیں ہوتا۔ اس کا خود مجھے بھی احساس ہے اور یقیناً آپ حضرات کو بھی ہوگا‘ لہٰذا اب میں اس اجمال کو اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق کے بھروسے پر قدرے تفصیل سے آپ کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔ آپ حضرات سے میری درخواست ہے کہ میری معروضات پر اپنی توجہات کو مرکوز رکھیے۔

تعمیرِ سیرت و کردار کا تعلق جذبات سے!

عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تعمیر سیرت و کردار کا انسان کی عقل یا فکر یا اس کے ذہن سے شاید زیادہ تعلق ہے‘ حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ تعمیر سیرت و کردار کا اصل تعلق انسان کے جذبات سے ہے۔ جذبات اگر صحیح رُخ اختیار کریں گے اور صحیح نہج پر اُبھریں گے تو کردار صحیح ہوگا‘ ورنہ بسا اوقات جو کچھ ہوتا ہے وہ میرے اور آپ کے مشاہدے بلکہ ذاتی تجربے کی بات ہے کہ ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی!

جبلی و فطری اور شعوری طور پر انسان نیکی اور بدی کی تمیز رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ بھلائی کیا ہے اور بُرائی کیا ہے‘ خیر کیا ہے اور شر کیا ہے؟ پھر ذرائع ابلاغ کے ذریعے کسی نہ کسی درجہ میں یہ

بات پھیلائی جاتی رہتی ہے کہ یہ خیر ہے‘ یہ شر ہے‘ یہ بھلائی ہے‘ یہ بُرائی ہے۔ محراب و منبر سے بھی اس کی تلقین و تبلیغ ہوتی رہی ہے اور اب بھی ہو رہی ہے۔ اسی طریقے سے اگر حکومت کے ایوانوں سے بھی اس کی نشر و اشاعت کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے تو بہر حال یہ بھی اپنی جگہ پر ایک مفید بات اور کام ہے۔ لیکن اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ لوگ جانتے نہیں ہیں کہ رشوت لینا اور دینا برا ہے۔ اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو معلوم نہیں ہے کہ جھوٹ بولنا‘ غیبت کرنا‘ بہتان لگانا برائی ہے۔ اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو علم نہیں ہے کہ خیانت‘ سرقہ‘ قمار‘ زنا بری شے ہیں‘ وعدہ خلافی بری بات ہے‘ دھوکہ دینا برائی ہے‘ ملاوٹ‘ ذخیرہ اندوزی‘ بلیک مارکیٹنگ‘ اسمگلنگ اور اسی نوع کی اخلاقی اور معاشرتی خرابیاں بدی ہیں۔ بھلائی بہر حال نہیں ہیں۔ کوئی بھی ان باتوں کو ذہناً اور شعوری طور پر اچھا نہیں سمجھتا‘ لیکن بات وہی ہے کہ بقولِ غالب ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی!

اصل مسئلہ یہ ہے کہ برائیوں کو چھوڑنے اور اچھائیوں کو اختیار کرنے پر طبیعت آمادہ نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ برائیوں میں لذت بھی ہے اور منفعت بھی[1]۔ قرآن حکیم کا فلسفہ تو یہ ہے کہ خیر و شر اور نیکی و بدی کی تمیز اور شعور فطرتِ انسانی میں موجود ہے۔ تمیز و امتیاز کی یہ صلاحیت و اہلیت اللہ تعالیٰ نے انسان کو الہامی و وجدانی طور پر عطا کی ہے۔ یہ علم اس کی جبلت و فطرت میں ودیعت شدہ ہے۔ چنانچہ سورۃ الشمس میں اس حقیقتِ کبریٰ کو بایں الفاظ بیان فرمایا گیا ہے:

﴿وَنَفۡسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝۷ فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَتَقۡوٰىهَا ۝۸﴾

’’اور قسم ہے نفس انسانی کی اور اُس ذات کی جس نے اُسے سنوارا‘ پھر اس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری اس پر الہام کر دی۔‘‘

ارادہ اور قوتِ ارادی کی اہمیت

اصل اور اہم ترین سوال یہ ہے کہ وہ کون سی چیز ہے جو انسان کو خیر‘ نیکی اور بھلائی کو اختیار کرنے پر آمادہ کرے‘ درآں حالیکہ اُسے خیر کو اختیار کرنے کی وجہ سے فوری طور پر کوئی تکلیف یا نقصان پہنچ رہا ہو! اور کون سا وہ جذبہ ہے جو اُسے شر‘ بدی اور برائی سے اجتناب کرنے پر آمادہ کرے‘ درآں حالیکہ اس سے اس کو فوری طور پر کوئی منفعت یا لذت حاصل ہو رہی ہو! ان

(۱) جیسے صحیح بخاری کی حدیث میں آیا ہے: حُجِبَتِ النَّارُ بِالشَّھَوَاتِ (مرتب)

تمام محرکات کے برعکس انسان کے جذبے کو مہمیز کرنے اور ارادے کو تقویت دینے والی شے کیا ہے؟ اس ضمن میں بڑی پیاری بات ہے جو علامہ اقبال مرحوم نے اپنے فلسفہ تعلیم کے ذیل میں کہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''نظامِ تعلیم میں اصل شے جو مطلوب ہے وہ عقل اور ذہن کی تربیت نہیں ہے' عقل اور ذہن کے اندر تو نمو اور ظہور کی خلقی (inherent) صلاحیت موجود ہے۔''

ان کی اس رائے کے ضمن میں یہ بات جان لیجیے کہ وہ علم جو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو عطا فرمایا تھا ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ كُلَّهَا﴾ (البقرۃ:۳۱) یہ درحقیقت اُس کا ظہور (exposure) ہے جو بہر حال ہونا ہی تھا۔ یہ تمام مادّی علوم' یہ تمام ٹیکنالوجی اور یہ تمام فزیکل سائنسز دراصل ان تمام کا علم بالقوّہ (potentially) حضرت آدم علیہ السلام کو دے دیا گیا تھا' جس کا تہذیب وتمدن اور علوم وفنون کی ترقی وارتقاء کے ساتھ ساتھ نمو اور ظہور ہوتا چلا آ رہا ہے' جس کے لیے میں انگریزی کا لفظ exfoliation استعمال کرتا ہوں۔ جیسے ایک بند کلی ہے' اس میں بالقوّہ پتیاں اور پھول موجود ہے' لیکن جب وہ کھلتی ہے تو پتیوں اور پھول کا ظہور ہوتا ہے۔ پس یہ علم تو انسانیت کو عطا ہو چکا تھا' لیکن اس کو تدریجاً ظہور پذیر ہونا تھا۔ جیسے کلی سے غنچہ اور پھر اس سے پھول بننے کے مدارج کی مثال ہے۔ اس کی دوسری مثال بیج اور درخت کی ہے کہ بیج میں بالقوّہ درخت موجود ہوتا ہے' لیکن پورا درخت بننے میں وقت لگتا ہے۔ چنانچہ یہ شے تو انسان میں پہلے سے ہی موجود تھی اور اسے بروئے کار آنا ہی تھا۔

علامہ اقبال مرحوم آگے کہتے ہیں کہ ''نظامِ تعلیم کی اصل ضرورت یہ ہے کہ وہ انسان میں ارادہ وعزم کی ایک کیفیت پیدا کرے اور قوتِ ارادی کی تربیت کرے''۔ مجھے یقین ہے کہ علامہ مرحوم کی اس بات سے آپ کا ذہن علامہ کی اردو اور فارسی کی شاعری کی اس خصوصیت کی طرف منتقل ہو گیا ہو گا جس کو انہوں نے ''تعمیرِ خودی'' سے تعبیر کیا ہے۔ ''تعمیرِ خودی'' یعنی انسان کے ارادے اور اس کی عزیمت کی تربیت اس نوع سے کہ جس چیز کو وہ صحیح اور درست سمجھتا ہے' اس پر اسے استقامت حاصل ہو' اور جس چیز کو وہ سمجھتا ہے کہ غلط ہے اس سے وہ رُک سکے' خواہ اس میں کوئی تکلیف آ رہی ہو اور خواہ وہ چیز اس کے لیے فوری طور پر کتنی ہی نقصان دہ بن رہی ہو۔ پس تربیتِ ارادہ ہی کو علامہ مرحوم نے اپنی شاعری میں تعمیرِ خودی سے تعبیر کیا ہے۔

اب ذرا ذہن میں لائیے کہ ہمارے یہاں تعمیر کردار کا جو عظیم نظام ایک طویل عرصے سے جاری رہا ہے' جسے عام طور پر ''تزکیۂ نفس'' کے نظام سے موسوم کیا جاتا ہے' وہ بڑا مؤثر نظام

تھا۔ یہ نہ سمجھئے کہ وہ کوئی بے بنیاد شے تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے ایسے ادارے (institutions) اِلا ماشاء اللہ' بگاڑ (corruption) کا شکار ہو گئے' ان میں فساد رونما ہو گیا۔ ہم میں سے اکثر وبیشتر لوگوں نے تو اسلام کی عظیم عبادات کو بھی محض رسومات بنا کر رکھ دیا ہے۔ بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

رہ گئی رسم اذاں رُوحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی!

تو اس طرح ہمارا وہ نظامِ تربیت اور ہمارے وہ ادارے بھی اس وقت اپنی اصل اور جڑ سے ہمیں ہٹے ہوئے نظر آ رہے ہیں' اِلا ماشاء اللہ' تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ادارے ہی بے بنیاد اور بے اصل تھے۔ ہمارے ہاں اصلاحِ اخلاق' تزکیہ نفس اور تعمیر وتربیت خودی کا جو نظام رائج رہا ہے اور اب بھی جیسے تیسے جاری ہے' یاد ہے کہ اس کا نقطۂ آغاز کیا لفظ ہے؟ وہ ہے ''مرید''۔ طلب ہدایت اور رہنمائی کے مقصد کے لیے کسی شخص کی طرف رجوع کرنے والا مرید ہوتا ہے۔ مرید کے معنی ہیں: ارادہ کرنے والا۔ جس نے عزم وارادہ کیا ہے کہ وہ ہدایت کی راہ پر چلے گا۔ انسان جانتا تو ہے کہ خیر یہ ہے اور شر یہ ہے' بھلائی یہ ہے اور برائی یہ ہے۔ لیکن اس کی اصل ضرورت یہ ہے کہ اس میں ایک ارادہ وجود میں آ جائے' پھر اس ارادے کو تقویت حاصل ہو' اس کی قوتِ ارادی مضبوط ہوتا کہ وہ خیر کی طرف پیش قدمی کر سکے' اگرچہ اس میں دشواری اور مشکل درپیش ہو۔ جیسے کہ حدیث شریف میں الفاظ آئے ہیں: حُجِبَتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ[۲] ''جنت بہت سی ناگوار چیزوں سے گھیر دی گئی ہے''۔ جنت کے حصول کے لیے بڑھنا ہو تو بڑی ناگوار کیفیات اور ناپسندیدہ مشکلات سے سابقہ پیش آ کر رہے گا۔ نفس پر شاق گزرنے والی باتوں اور کاموں سے واسطہ پڑ کر رہے گا۔ آگ اور خون کی وادیوں ہی سے گزر کر انسان جنت تک پہنچ سکتا ہے۔ کوئی ٹھنڈی سڑک جنت کی طرف لے جانے والی نہیں ہے۔ سختیاں اور شدائد ومصائب جنت کی راہ کے سنگ ہائے میل ہیں۔ ان سب چیزوں اور مرحلوں کا مقابلہ ومواجہہ (face) کرنے کا ایک پختہ ارادہ وجود میں آئے اور اس ارادے کو تقویت دینے والا ایک نظام موجود ہو تو جنت کی شاہراہ پر انسان کی پیش قدمی ممکن ہو سکے گی۔ ہمارا خانقاہی نظام درحقیقت اسی بنیاد پر قائم تھا اور اسی لیے اس کا نقطہ آغاز تھا لفظ مرید' یعنی وہ

(۲) صحیح البخاری' عن ابی ھریرۃ ؓ۔

شخص جس نے خیر کی راہ پر چلنے کا ارادہ کر لیا ہے اور خود کمر ہمت کس لی ہے‘ اب اس کو ایک ایسا نظام درکار ہے جو اس کے ارادے کو تقویت دینے کا باعث ہو۔

علم کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے!

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کے اندر یہ ارادہ پیدا کرنے اور اُسے تقویت دینے والی شے کیا ہے؟ یا جس کے متعلق میں نے کہا تھا کہ جذبات کو صحیح رُخ پر ڈالنے والی چیز کون سی ہے؟ اگرچہ تعمیر کردار کا اصل تعلق انسان کے جذبات کے ساتھ ہے‘ اصل ضرورت علم و فہم کی نہیں ہے‘ وہ اپنی جگہ اہم ہیں‘ ان کا اپنا ایک مقام ہے‘ لیکن یہاں جو موضوع زیر بحث ہے وہ ہے تعمیر کردار—— کردار کے اعتبار سے ہو سکتا ہے کہ ایک اَن پڑھ شخص کسی بڑے فلسفی سے بھی بہت بلند ہو۔ یہ نہ سمجھئے گا کہ میں علم کی اہمیت کی نفی کر رہا ہوں۔ وہ اپنی جگہ مسلّم ہے‘ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ جس موضوع پر ہم اس وقت گفتگو کر رہے ہیں اس کے اعتبار سے کس چیز کی زیادہ اہمیت ہے۔ مولانا رومؒ کا وہ شعر یاد کیجیے کہ ؎

علم را بر دل زنی یارے بود!
علم را بر تن زنی مارے بود!

وہی علم ہے کہ اگر انسان اس کو اپنے دل پر ڈالے‘ اس کا سایہ دل پر پڑے‘ اس کا انعکاس قلب پر ہو تو وہ علم انسان کا دوست ہے‘ اس کو سیدھی راہ بتانے والا ہے۔ اور وہی علم اگر تن و توش پر ڈال دیا جائے اور اس کو صرف انسان اپنی معاش کے حصول کا ذریعہ بنا لے یا دنیا کمانے کا ایک وسیلہ سمجھ بیٹھے تو وہ انسان کے حق میں سانپ ہے۔ علم کی نفی ہرگز مقصود نہیں ہے‘ اس کی اپنی جگہ بہت بڑی اہمیت ہے۔ بجوائے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّمَا یَخۡشَی اللّٰہَ مِنۡ عِبَادِہِ الۡعُلَمٰٓؤُا ؕ﴾ (فاطر:۲۸) ’’یقیناً اللہ سے ڈرتے تو اُس کے بندوں میں سے وہی ہیں جو اہل علم ہیں‘‘۔ پھر علم کا جو مرتبہ اور مقام ہے اس کے لیے نبی اکرمﷺ کا یہ فرمان بھی موجود ہے کہ ’’رات بھر کی عبادت کے مقابلے میں ایک عالم دین کی گھڑی بھر کی تعلیم و تعلّم افضل ہے‘‘۔ ہمارے دین میں نسبت و تناسب یہ ہے کہ ایک شخص پوری رات نوافل کی ادائیگی کے لیے کھڑا رہتا ہے‘ اس کے مقابلے میں ایک عالم دین کے درس و تدریس میں ایک گھنٹہ صرف کرتا ہے تو اس دوسرے کام کو آنحضورﷺ افضل قرار دے رہے ہیں۔ پس علم کا بلند مقام اپنی جگہ ہے۔ میں جو بات بیان کر رہا ہوں‘ وہ یہ ہے کہ اصل میں تعمیر کردار و سیرت کا تعلق جذبات سے ہے‘ فکر و فہم سے

نہیں ہے۔ اس کا تعلق انسان کے ارادے سے ہے اور اس ارادے کو تقویت کی ضرورت ہے۔

انسانی جذبات کی دو نوعیتیں: جذبۂ محبت اور جذبۂ خوف

اس موضوع سے متعلق یہ بات بھی جان لیجیے کہ انسانی جذبات دو نوعیتوں کے ہوتے ہیں‘ یا جذبہ محبت کا ہوتا ہے یا جذبہ خوف کا۔ یہ دونوں بنیادی جذبات ہیں کہ جن کے تحت انسان کی سیرت‘ اس کا کردار‘ اس کا اخلاق اور اس کا رویہ بنتا اور بگڑتا ہے اور ان ہی دونوں جذبات کے تحت ایک انسان کی زندگی کے اعمال اور معاملات ایک مخصوص شکل اور نہج و طرز اختیار کرتے ہیں۔ پس انسان کے تمام جذبات محبت اور خوف پر مبنی ہوتے ہیں۔ ہم محبت کو مثبت اور خوف کو منفی جذبہ کہہ سکتے ہیں۔

اب ذرا جائزہ لیجیے کہ دنیا میں اس وقت جتنے بھی نظام ہائے فکر و عمل موجود ہیں‘ ان میں آپ دیکھیں گے کہ ان نظاموں میں انسانی تہذیب و تمدن اور سیاسیات و عمرانیات کی اجتماعی گاڑی چلانے کی اسکیم میں ملک کے رہنے والے لوگوں کی تعمیر کردار اور تعمیر سیرت و شخصیت کے لیے ان دونوں جذبات کو کسی نہ کسی اعتبار سے سمویا اور استعمال (apply) کیا گیا ہے۔ محبت کے اعتبار سے دیکھئے تو ان تمام نظام ہائے فکر و عمل میں اپنے وطن کی محبت‘ اپنی قوم کی محبت یا اپنی تاریخ کی کسی عظیم شخصیت کی محبت (hero worship)‘ یہ محبتیں آپ کو دنیا کے اکثر و بیشتر معاشرے کے لوگوں کی تعمیر کردار و سیرت میں نمایاں طور پر کارفرما نظر آئیں گی۔ اور امر واقعہ بھی یہی ہے کہ ان محبتوں کی بنیاد پر ایک کردار وجود میں آتا ہے اور ہم دنیا میں اس کا مشاہدہ سر کی آنکھ سے کر سکتے ہیں۔ اسے قوم پرستانہ سیرت کہیں‘ شخصیت پرستانہ کردار کہیں‘ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ان میں سے ہر ایک محبت کی بنا پر ایک کردار وجود میں آتا ہے۔ اگر انسان میں واقعی اپنے وطن‘ اپنی قوم اور اپنے مشاہیر (heroes) کی محبت ہے تو اس میں اپنی قوم کی سربلندی اور اپنے وطن کی عظمت کے لیے‘ اپنے وقار اور غیرت کے لیے ایثار و قربانی اور محنت و مشقت کا جذبہ پیدا ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان جذبات اور ایثار و قربانی کی بدولت اکثر قوموں نے دنیا میں بہت کچھ حاصل (achieve) کیا ہے اور وہ فائز المرام ہوئی ہیں۔ آخر اس وقت دنیا میں مسلمانوں کے علاوہ جو بے شمار قومیں ہیں وہ خدا پرست قومیں تو نہیں ہیں‘ ان کا آخرت پر تو کوئی یقین ہی نہیں ہے۔ ان کے یہاں اس وقت جو بھی نظام ہے وہ درحقیقت اسی نوع کی محبتوں کی بنیاد پر قائم ہے۔ یہی محبتیں ان قوموں کے جذبات کو متحرک (motivate) کرتی

اور رکھتی ہیں۔ اس طرح بھی انسانوں میں ایک زوردار جذبۂ عمل اُبھرتا ہے' ایک مضبوط کردار وجود میں آتا ہے' جو اپنے معاشرے اور اپنے ملک کو مضبوط بنیادیں فراہم کرتا ہے۔

تعمیرِ سیرت وکردار میں حُبّ الوطنی وقوم پرستی کی اہمیت

ہمارا معاملہ اس وقت یہ ہے کہ ہمارا جو اصل نظامِ فکر ہے' جس کو عام طور پر ہم ''نظامِ عقائد'' سے تعبیر کرتے ہیں' اس میں وطن اور قوم کی عظمت اور شخصیت پرستی کی کوئی جگہ نہیں۔ زمین کے تقدس کا کوئی احساس ہمارے دلوں میں راسخ نہیں۔ زمین زمین ہے' رہنے کی جگہ ہے' اس میں ہماری معاش ہے' بس اس سے زائد تو کچھ نہیں۔ یہ کوئی دیوی نہیں' کوئی دیوتا نہیں۔ یہ کوئی ماتا نہیں—— ''دھرتی ماتا'' کا کوئی تصور ہمارے نظامِ فکر میں موجود نہیں (۳)۔ وطن اور زمین کے لیے ہمارے یہاں جو تقدس کا لفظ بعض اوقات استعمال ہو جاتا ہے وہ بھی دوسروں کے دیکھا دیکھی زبان پر یا تحریر میں آجاتا ہے اور بس۔ لیکن واقعتاً ہمارے احساسات جس فکر کے تابع ہیں اور ہمارا خمیر جس مٹی سے اُٹھا ہے' اس میں ایسی کوئی چیز موجود نہیں ہے اور نہ اس کی کوئی گنجائش ہے۔ ہمارا معاملہ کچھ ''اور'' ہے (۴) —— لیکن بدقسمتی سے وہ ''اور'' تو موجود ہے نہیں۔ یہ بات بھی صحیح ہے کہ وطن کی تقدیس کا تصور بھی ہمارے ہاں موجود نہیں ہے' تو یوں سمجھئے گویا ہمارے پاؤں تلے زمین ہی نہیں ہے۔ وہ ''اور'' یہ ہے کہ اسلام جو برتر' بالاتر اور ارفع واعلیٰ محبتیں ہمارے دلوں میں پیدا اور راسخ کرنا چاہتا ہے وہ اللہ کی محبت' اُس کے رسول ﷺ کی محبت اور اُس کی راہ میں جہاد کی محبت ہے۔ اس پر تفصیل سے میں آگے کچھ عرض

---

(۳) اس کے برعکس قرآن حکیم کا ارشاد تو یہ ہے کہ: ﴿یٰعِبَادِیَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّ اَرۡضِیۡ وَاسِعَۃٌ فَاِیَّایَ فَاعۡبُدُوۡنِ﴿۵۶﴾﴾ (العنکبوت) ''اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو' میری زمین وسیع ہے' پس تم میری ہی بندگی بجالاؤ''۔ یعنی تمہاری تخلیق کی اصل غایت عبادتِ ربّ ہے۔ اگر کسی مؤمن کو اپنے وطن میں عبادت کے تقاضے پورے کرنے میں مشکل پیش آ رہی ہو تو وہ اپنے وطن کو چھوڑ کر وہاں چلا جائے جہاں وہ اللہ کا بندہ بن کر رہ سکے۔ اسی آیت کے پیشِ نظر ہجرتِ حبشہ واقعہ ہوئی تھی۔ (مرتب)

(۴) اس بات کی علامہ اقبال مرحوم نے یوں تفسیر کی ہے:

اپنی ملّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ (مرتب)

کروں گا۔ بہرحال یہ محبتیں جن کی بنیاد پر دنیا کچھ نہ کچھ کھڑی ہے اور ان کے یہاں ایک قومی کردار موجود ہے' ان کی اپنی جگہ اہمیت ہے۔ چنانچہ وہ دوسروں کو دھوکہ دے لیں گے لیکن اپنی قوم کو دھوکہ نہیں دیتے' وہ دوسری قوموں کو فریب دے لیں گے' ان سے عہد شکنی کریں گے' ان پر جور و تعدی کر لیں گے' لیکن اپنی قوم کے ساتھ یہ معاملہ نہیں کرتے۔ یہ بڑی بنیادی بات ہے۔ دیکھئے نبی اکرم ﷺ نے دعوتِ اسلامی کے آغاز میں اسی بنیادی بات کو اپنے ایک خطبے میں بطور استدلال استعمال فرمایا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بالکل ابتدا ہی میں آنحضور ﷺ نے یہ خطبہ بنوہاشم یا قبیلہ قریش کے سربرآوردہ افراد کے کسی اجتماع میں ارشاد فرمایا تھا۔ نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں:

((اِنَّ الرَّآئِدَ لَا یَکۡذِبُ اَھۡلَہٗ، وَاللّٰہِ لَوۡ کَذَبۡتُ النَّاسَ جَمِیۡعًا مَا کَذَبۡتُکُمۡ، وَلَوۡ غَرَرۡتُ النَّاسَ جَمِیۡعًا مَا غَرَرۡتُکُمۡ، وَاللّٰہِ الَّذِیۡ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اِنِّیۡ لَرَسُوۡلُ اللّٰہِ اِلَیۡکُمۡ خَاصَّۃً وَّ اِلَی النَّاسِ کَآفَّۃً))

''(لوگو!) تم جانتے ہو کہ رائد (قافلے کا رہنما) اپنے قافلے والوں سے کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ اللہ کی قسم! اگر (بفرض محال) میں تمام انسانوں سے جھوٹ کہہ سکتا تب بھی تم سے کبھی جھوٹ نہ بولتا اور اگر (بفرضِ محال) میں تمام انسانوں کو دھوکہ اور فریب دے سکتا تب بھی تمہیں کبھی نہ دیتا۔ اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں! میں اللہ کا رسول ہوں' تمہاری طرف خصوصاً اور پوری نوعِ انسانی کی طرف عموماً!''

یہ اُس خطبے کی تمہید ہے۔ میرا جو کتابچہ ''دعوت الی اللہ'' کے نام سے دستیاب ہے' اس میں یہ پورا خطبہ موجود ہے۔ بڑا ہی عظیم خطبہ ہے' اگرچہ نہایت مختصر ہے' لیکن انتہائی جامع ہے۔ دعوتِ اسلامی کا خلاصہ' اس کا لُبِّ لُباب' اس کا جوہر اس میں موجود ہے۔ ساتھ ہی اس میں یہ بات بھی بتا دی گئی ہے کہ کس شے کی اقدمیت ہے اور کون سی چیز مؤخر ہے۔ پھر اس میں خطابت اپنی معراج پر ہے۔ گو چند جملے ہیں۔ حضور ﷺ کا اپنا ارشاد ہے کہ ((اَنَا اَفۡصَحُ الۡعَرَبِ))۔ اس خطبے کا تمہیدی جملہ دیکھئے اس میں کتنی مؤثر اپیل ہے۔

فرمایا کہ تم تو میرے اپنے ہو (You are my khith and kin) میں تم کو کیسے دھوکہ دے سکتا ہوں؟ جس طرح قافلے کا راہنما اپنے قافلے والوں کو دھوکہ دے کر ہلاکت میں نہیں ڈال سکتا' اسی طرح میں تمہارے ساتھ دھوکہ اور فریب کا معاملہ کیسے کر سکتا ہوں؟ میں اگر

(بالفرض) پوری دُنیا سے جھوٹ بول سکتا تو تم سے کبھی نہ بولتا اور (بالفرض) اگر میں پوری دنیا کو فریب دے سکتا تو تم کو کبھی نہ دیتا۔ چونکہ اُس وقت مکہ والوں کی ذہنی سطح قوم پرستانہ ہی تھی‘ چنانچہ ’’كَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰى قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ‘‘ کے پیشِ نظر نبی اکرمﷺ نے ان کی اس ذہنی سطح اور افتادِ طبع کے مطابق اپنے اس خطبے کی تمہید باندھی۔

اگر قوم کی عظمت کا کوئی احساس ہو یا وطن کے تقدس کا کوئی لحاظ ہو‘ جیسے ’’جے ہند‘‘ کا نعرہ‘ تو یہ چیزیں اور نعرے دلوں کو گرماتے ہیں۔ اگر واقعی قوم اور وطن سے محبت ہے تو ان چیزوں اور نعروں سے انسان کے دل میں ایک جذبۂ عمل اُبھرے گا‘ اس کی خوابیدہ قوت بروئے کار آ جائے گی۔ پھر وہ قوم و وطن کے لیے قربانیاں دے گا۔ بڑے سے بڑے کٹھن مراحل سے گزر جائے گا۔ پس قوم اور وطن کی محبت وہ چیزیں ہیں جن کو دنیا کے بہت سے نظام ہائے فکر میں جذبات کو انگیخت کرنے اور تعمیر کردار کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔ ان محبتوں کی بنا پر ایک قومی کردار وجود میں آتا ہے جس سے یہ ضرور ہوتا ہے کہ انسان اپنی قوم اور اپنے اہلِ وطن سے نہ دھوکہ اور فریب سے کام لیتا ہے‘ نہ قوم اور وطن سے غداری کرتا ہے۔ تو اس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ قوم کی عزت اور وقار محفوظ رہتا ہے اور اُسے عالمی سطح پر ایک مقام میسر آتا ہے۔

تعمیرِ سیرت و کردار میں ’نظریہ حُبِّ انسانی‘ بلند تر ہے!

اسی محبت کے جذبے کو پیدا کرنے کے ضمن میں زمانہ حال میں ایک اور مظہر ہمارے سامنے آیا ہے اور وہ ہے کسی نظریہ کی محبت‘ اور اس نظریے کا بول بالا کرنے کی محبت اور جذبہ —— اس فکر کا جب تجزیہ کیا جائے گا تو معلوم ہو گا کہ اس کی تہہ میں درحقیقت انسان کی محبت کارفرما نظر آئے گی۔ گویا وطن سے محبت‘ قوم سے محبت‘ کسی قومی شخصیت سے محبت‘ ان تین محبتوں سے ایک بالاتر محبت بھی ہے اور وہ ہے انسان دوستی اور انسان سے محبت —— فلسفہ میں آج کل اس کا بڑا چرچا ہے‘ اس پر بہت زور ہے اور اس کا بہت پرچار کیا جا رہا ہے۔ اسے فلسفے میں Humanism یعنی انسان دوستی یا حُبِ انسان سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اگر آپ غور کریں تو آپ تسلیم کریں گے کہ یہ محبت آفاقی بھی ہے اور انسان کی خیر کے لیے یہ بھی ایک بہت بڑا جذبۂ محرکہ (motivating force) بن سکتی ہے۔ اس کا یہ عملی مظہر ضرور سامنے آیا ہے کہ جب کوئی ایسی idealogy اور کوئی ایسا نظریہ انسان کے سامنے آتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس نظریے کو اختیار کرنے میں انسانیت کی خیر اور بھلائی ہے‘ اس سے ظلم ختم ہو جائے گا‘

استحصال کی بیخ کنی ہو جائے گی‘ اس نظریے کے بروئے کار آنے سے عدل وقسط اور منصفانہ نظامِ اجتماعی قائم ہو سکے گا جس کی بدولت انسان کو امن و سکون اور چین میسر آئے گا‘ مثلاً یہ کہ ایک ایسی سوسائٹی وجود میں آ جائے گی جس میں طبقاتی امتیاز اور فرق و تفاوت ختم ہو جائے گا‘ سب انسان برابر ہو جائیں گے‘ حقیقی مساوات قائم ہو جائے گی تو انسان دوستی کے جذبے کے پیشِ نظر یہ نظریہ انسان کے تصورات اور تخیلات (imaginations) کو قابو (catch) کرتا اور انسانوں کے اذہان و قلوب کو مطمئن اور قائل (convince) کرتا ہے۔ پھر جو لوگ اس نظریے کو دل و جان سے قبول کرتے ہیں وہ اس کے پرچار اور اس کے مطابق ایک نظام بالفعل قائم کرنے کے لیے محنت و مشقت کرتے ہیں۔ اپنا تن‘ من اور دھن اس کے لیے نچھاور کرتے ہیں‘ قربانیاں دیتے ہیں‘ ایثار کرتے ہیں‘ پھانسیوں کے پھندوں کو چوم کر اپنی گردنوں میں ڈالتے ہیں‘ اپنے گریبان کھول کر اور سینہ تان فائرنگ سکواڈز کا مواجہہ کرتے ہیں‘ تو اس تمام عمل کی تہہ میں دراصل حُبِ انسانیت (Humanism) کا جذبہ ہی کارفرما ہوتا ہے جو ان کو اتنی عظیم قربانیاں دینے پر آمادہ کرتا ہے۔

گزشتہ جنگِ عظیم کے موقع پر جرمن اور جاپانی قوم کا جو جذبہ تھا وہ تو یقیناً ان کی قوم پرستی کی بنیاد پر تھا۔ وہ کسی نظریے (ideology) کے غلبے اور تسلط کے لیے نہیں بلکہ ملک گیری اور اپنے ملک و قوم کے استیلاء اور اپنی حکومت کی وسعت کے تحت تھا۔ لیکن ان کے مقابلے میں وہ ملک بھی تھا جس کے پاس ایک انقلابی نظریہ ہے اور وہ ممالک بھی تھے جن کا نعرہ (catch word) جمہوریت ہے۔ آپ حضرات سمجھ گئے ہوں گے کہ میں کس کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔ کمیونزم انقلاب کی کامیابی سے قبل اس نظریے کے پرچار اور اس نظریے پر مبنی ایک نظامِ مملکت قائم کرنے کی جدوجہد میں کامریڈ مردوں اور کامریڈ عورتوں نے جو قربانیاں دی ہیں‘ ایثار کی جو نظیریں قائم کی ہیں اور جابر و مستبد شخصی حکمرانوں کے تشدد و مظالم اور جور و ستم کو جس طرح برداشت کیا ہے‘ دل پر ہاتھ رکھ کر بتایئے کہ اس کی تہہ میں کون سا قوم پرستانہ جذبہ تھا؟ یہ دراصل ایک ’نظریہ‘ کی محبت کا جذبہ تھا جسے ایک اعتبار سے وطن و قوم اور شخصیت پرستی سے بالاتر محبت یعنی حُبِ انسانیت (Humanism) سے تعبیر کیا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ آخر انسان میں اللہ تعالیٰ نے ترفع اور بلندی بھی رکھی ہے: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ﴿۴﴾﴾ (التین)۔ اس میں اپنی ذات‘ اپنی قوم اور اپنے ملک و وطن کی خیر خواہی‘ عظمت اور وقار سے بلند

ہو کر پوری انسانیت کے خیر وصلاح کے لیے سوچنے اور اس کے لیے عملی جدّوجُہد کرنے کی صلاحیت بھی ودیعت کی گئی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اُس ذاتِ گرامی کے جمال وجلال اور کمال سے محجوب اور اس کی نازل کردہ ہدایت سے محروم ہو کر اپنے فکر وفہم سے حُبِ انسانیت اور انسان دوستی کے نظریات وضع کرتا اور ان کو اختیار کرتا ہے تو اس طرح افراط وتفریط کے گورکھ دھندے میں اُلجھ کر اور ایک طلسم خیال وتخیل میں گرفتار ہو کر رہ جاتا ہے۔ بہرحال انسان دوستی اور اشتراکیت کے فلسفے میں قوم ووطن پرستی کے مقابلے میں ایک ترفع ہے‘ خواہ وہ ہمیں نظر نہ آئے یا ہمارے ادراک کی اس تک رسائی نہ ہو۔

تو یہ ہے ایک ایسی محبت جو بسا اوقات انسان سے بڑے عظیم کارہائے نمایاں سرانجام دلا دیتی ہے اور وہ کام کرا لیتی ہے جو بادیٔ النظر میں اَن ہونے معلوم ہوتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ انسان کے اندر سے قوت وبرداشت کا لاوا اُبلتا ہے۔ یہ محبت خودغرضی کو ختم کر کے رکھ دیتی ہے۔ انسان ایک مقصد‘ ایک آئیڈیل‘ ایک آدرش‘ ایک نصب العین کے لیے تن من دھن سب کچھ قربان کر دیتا ہے۔ یہ سب کچھ بنیادی طور پر اسی محبت کا غیر معمولی مظہر ہوتا ہے جو کسی خیال یا نظریہ یا شخصیت کی محبت اس طرح گھر کر لیتی ہے کہ جس کے نتیجے میں ایسے کردار اور ایسی سیرت کی تعمیر ہوتی ہے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ سیرت وکردار نام ہی مضبوط قوتِ ارادی کا ہے۔ تو کیا آپ کے خیال میں اس مضبوط قوتِ ارادی اور عزیمت کے بغیر دنیا میں کوئی انقلابی تحریک چل سکتی ہے؟ ایک نظام کو بیخ وبن سے اکھاڑ کر ایک دوسرا نظام قائم کرنا ہے‘ انقلاب برپا کرنا ہے‘ تو جو لوگ اس کا داعیہ لے کر سامنے آئیں گے‘ جو اس کا بیڑا اٹھائیں گے ان کے اندر تو بڑی زبردست قوتِ ارادی کی ضرورت ہے‘ اور یہ قوتِ ارادی پیدا ہوتی ہے اس انقلابی نظریے‘ اس انقلابی خیال اور اس انقلابی نظام کی محبت سے۔ اور جب اس کا مزید تجزیہ کیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ اس کی تہہ میں دراصل انسان کی محبت‘ انسان کی فلاح‘ انسان کے ایک بہتر مستقبل کی خواہش مستور نظر آئے گی۔

اسلام میں تعمیرِ سیرت وکردار کی اوّلین بنیاد: محبتِ الٰہی

اب دیکھئے کہ اس مقصد کے لیے اسلام کون سی بنیاد دیتا ہے۔ تعمیر سیرت وکردار کے لیے اسلام نے جو بنیاد دی ہے وہ یہی محبت کی بنیاد ہے۔ اسلام اولین اور اقدم ترین محبت‘ اللہ کی محبت کو قرار دیتا ہے۔ میں نے آج آغاز میں جن آیات کی تلاوت کی ہے ان میں سب سے

پہلے میں نے سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۶۵ کا درمیانی حصہ پڑھا ہے۔ اس سے قبل کے الفاظِ مبارکہ بھی ملاحظہ کیجیے۔ فرمایا:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّتَّخِذُ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اَنۡدَادًا يُّحِبُّوۡنَهُمۡ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ﴾

’’اور لوگوں میں ایسے بھی لوگ ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا ہمسر اور مدمقابل بناتے ہیں اور ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی اللہ کے ساتھ ہونی چاہیے۔ حالانکہ ایمان رکھنے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں۔‘‘

قرآن حکیم کا اعجاز وایجاز دیکھئے کہ نہایت اختصار لیکن انتہائی جامعیت کے ساتھ اس سارے فلسفے پر تبصرہ کر دیا۔ انسان میں محبت کا یہ جذبہ درحقیقت اللہ کی محبت کے لیے رکھا گیا تھا۔ اگر یہ جذبۂ محبت کسی اور چیز سے منسلک اور وابستہ (attach) ہو گیا ہے‘ دل کی سنگھاسن پر اللہ کی محبت کے بجائے کوئی اور محبت براجمان ہوگئی ہے تو یہ بے راہ رَوی (perversion) ہے۔ وہ جذبہ محبت غلط رُخ پر پڑ گیا ہے۔ از روئے قرآن حکیم انسان کی محبت کا اصل مرکز درحقیقت ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ بھوک انسان کی جبلت میں ہے اور ہر شخص کوشش کرتا ہے کہ بھوک مٹانے کے لیے اچھی سے اچھی‘ صالح‘ مفید‘ طیب غذا حاصل کرے۔ لیکن یہ داعیہ اتنا شدید ہے کہ اگر انسان کو کسی وقت اچھی غذا نہیں ملتی تو اس مجبوری کی حالت میں یہ داعیہ انسان کو بری غذا پر منہ مارنے پر آمادہ کر دیتا ہے۔ چنانچہ فطرتِ انسانی کی اسی کمزوری کے پیش نظر ﴿خُلِقَ الۡاِنۡسَانُ ضَعِيۡفًا ﴿۲۸﴾﴾ (النساء) قرآن مجید میں چھوٹ اور رعایت دی گئی ہے کہ اضطرار اور انتہائی مجبوری کی حالت میں حرام چیز کھائی جاسکتی ہے۔ یہ استثناء سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۳ اور سورۃ المائدۃ کی آیت ۳ میں بیان ہوا ہے۔ ایک شخص اضطرار کی حالت میں آگیا ہے‘ کچھ اور کھانے کو نہیں ہے تو وہ جان بچانے کی خاطر حرام غذا میں بھی منہ مار سکتا ہے‘ اس کی اجازت ہے۔ اسی طرح فاطر فطرت نے انسان کے اندر محبت کا یہ جذبہ رکھا تو اس لیے تھا کہ مجھ سے محبت کرو!

﴿وَمَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَالۡاِنۡسَ اِلَّا لِيَعۡبُدُوۡنِ ﴿۵۶﴾﴾ (الذّٰریٰت)

’’میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔‘‘

اور بندگی کے متعلق میں کئی بار عرض کر چکا ہوں کہ اس کا جسد ظاہری اطاعت اور روح باطنی محبت ہے۔ عبادت اصل میں کہتے ہی اس کو ہیں جو کسی ہستی کی محبت سے سرشار ہو کر کی جا رہی ہو۔ کسی ہستی کی عظمت کے جذبے اور احساس سے انسان ایک عجز اور تذلّل کی کیفیت اپنے اندر پائے اور اس کے سامنے جھک جائے۔ امام ابن قیم ؒ نے عبادت کی تعریف یوں کی ہے: ''العبادةُ تجمع اصلین :غاية الحب مع غاية الذُّلّ وَالخُضوع'' یعنی عبادت میں دو بنیادی چیزیں لازماً شامل ہوں گی۔ ایک انتہائی درجے کی محبت یعنی انتہائی شوق و رغبت' وارفتگی اور دل کی آمادگی اور انبساط ونشاط کے ساتھ اپنے معبود سے محبت اور اس کے ساتھ ساتھ نہایت درجے کی عاجزی اور فروتنی۔ لیکن انسان نے جس طرح عبودیت میں شریک ٹھہرا لیے اسی طرح وہ شرک فی المحبت میں مبتلا ہو گیا اور طیب ومحمود محبت کو چھوڑ کر نجس و ناپاک راہ پر گامزن ہو گیا۔

اسی بنا پر علامہ اقبال مرحوم نے وطن کو اس دور کا سب سے بڑا بت کہا ہے۔ جب وطنیت کے نظریے کو محبت کا اصل مرکز بنا دیا گیا تو درحقیقت وطن کو وہاں بٹھایا گیا جہاں اللہ کو ہونا چاہیے تھا۔ چنانچہ علامہ مرحوم نے کیا خوب کہا ہے:

اِس دور میں مے اور ہے' جام اور ہے' جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

غیر اللہ کو محبت کے سنگھاسن پر بٹھانے اور لوگوں کی ذہنی پستی پر قرآن حکیم نے کتنا معجزانہ اور مختصر مگر جامع تبصرہ صرف چند الفاظِ مبارکہ میں فرمایا ہے: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ط﴾ گویا انہیں طیب اور حلال غذا میسر نہیں آئی' اس لیے یہ غلیظ' نجس اور گندی غذا پر منہ مار رہے ہیں۔ طیب و پاکیزہ چیز کیا ہے؟ وہ ہے اللہ تعالیٰ کی شدید ترین محبت ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ط﴾ ایمان کا اصل تقاضا کیا ہے؟ ایمان کا اصل مظہر کیا ہے؟ اگر دل میں ایمانِ حقیقی موجود ہو تو اس کا ظہور کس شکل میں ہو گا؟ وہ شکل

ہے: ﴿اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ط﴾ —— تمام چیزوں کی محبت کے مقابلے میں شدید ترین محبت جب تک اللہ کی نہیں ہو جائے گی تو جان لیجیے ایمانِ حقیقی موجود نہیں ہے۔ اس موضوع پر' ان شاء اللہ' قدرے تفصیل سے گفتگو ہو گی۔

ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت: ایمان باللہ کی فروع

ہمارے مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب میں ایمان کے مباحث کے ضمن میں تفصیل سے عرض کیا کرتا ہوں کہ ''ایمان'' اصل میں نام ہے ایمان باللہ کا۔ ایمان بالرسالت اور ایمان بالمعاد یا ایمان بالآخرۃ دراصل اسی ''ایمان باللہ'' کی فروع (corollaries) ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی صفت ہدایت کا تکمیلی مظہر ہے: نبوت و رسالت —— اور اللہ کی صفت عدل کا تکمیلی مظہر ہے: بعث بعد الموت اور آخرت۔ یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی دو صفاتِ کمال کے دو مظہر ہیں۔ پس اصل ایمان کیا ہوا: ایمان باللہ۔ باقی ایمانیات اس کی شرح و تفصیل ہیں۔ ع ''یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں!'' یہ بات پوری طرح ہمارے ذہن نشین ہو سکتی ہے اگر ہم ''ایمانِ مجمل'' اور ''ایمانِ مفصل'' کو سامنے رکھیں۔ ایمانِ مجمل میں صرف اللہ کا ذکر ہے: ''اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ كَمَا هُوَ بِاَسْمَآئِهٖ وَصِفَاتِهٖ وَقَبِلْتُ جَمِيْعَ اَحْكَامِهٖ اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَتَصْدِيْقٌ بِالْقَلْبِ''، مجمل ایمان پورا ہو گیا۔ ہاں جب اس ایمان کی تشریح و تفصیل درکار ہو تو ''ایمانِ مفصل'' یہ ہو گا: ''اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ'' —— بالکل اسی طرح سمجھیے کہ اصلاً جو محبت' سیرت و کردار کا بنیادی پتھر (corner stone) ہے' وہ ہے محبتِ الٰہی —— لیکن اسی محبت کے ساتھ کچھ اور محبتیں بھی جڑی ہوئی (bracketed) ہیں' جو اسی محبتِ خداوندی کی شرح و تفصیل ہیں۔ ان محبتوں میں نمبر ایک پر آئے گی محبتِ رسول ﷺ(۵)۔ میں نے یہاں پر جان بوجھ کر ''عشقِ رسول ﷺ'' استعمال نہیں کیا۔ اس لیے کہ یہ لفظ نہ قرآن کا ہے نہ حدیث کا۔ عربی زبان میں ''عشق'' ایک بڑی منفی کیفیت کا نام ہے۔ قرآن و حدیث میں عربی کے جو الفاظ منتخب (choose) کیے گئے ہیں' ان میں بڑی بڑی حکمتیں ہیں۔ قرآن و حدیث کے الفاظ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ افصح العرب کے منتخب کردہ ہیں۔ یہ ان کا انتخاب ہے کہ کون

(۵) حدیث رسول ﷺ: ((لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ)) (صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب حب الرسول من الایمان) (مرتب)

سا لفظ لینا ہے اور کون سا نہیں لینا۔ چنانچہ لفظ ''حب'' (محبت) لیا ہے' عشق نہیں لیا۔ لفظ عشق میں کسی کی شیفتگی میں سوکھنے کا مفہوم شامل ہے' جبکہ لفظ محبت میں جوشِ عمل واقدام اور پروانہ وار شوقِ جاں نثاری وقربانی کے مفاہیم شامل ہیں۔ لہٰذا محبت جوش وخروش اور جان نثاری کا ایک مظہر ہے جبکہ عشق کسی کی محبت میں سوکھنے' دل گرفتہ ہونے اور عمل سے تہی دست ہونے کا مظہر ہے۔ تو انسانی کردار کو بے عمل بنانا مقصود نہیں ہے' بلکہ اس کو فعال بنانا مطلوب ہے۔ البتہ فارسی فلسفۂ محبت کا جو ذہنی پس منظر تھا' اس میں عشق ہی کی کیفیات مطلوب ومقصود تھیں۔ لہٰذا ان کی شاعری اور انشاپردازی میں لفظ عشق نے جگہ پائی اور وہیں سے یہ لفظ اردو ادب میں بھی آ گیا اور ہمارے یہاں ''عشقِ رسول ﷺ'' کی اصطلاح رواج پا گئی۔(۶)

تعمیر کردار اور سیرت سازی کے لیے از روئے قرآن جو مضبوط اور قابل اعتماد سہارا ہے' وہ دراصل محبتِ الٰہی ہے۔ یہی **العروۃ الوثقٰی** ہے۔ یاد کیجیے کہ آیت الکرسی کے فوراً بعد والی آیت کے آخری ٹکڑے میں فرمایا گیا: ﴿فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْ م بِاللّٰہِ فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَۃِ الْوُثْقٰی ق لَا انْفِصَامَ لَھَا ط﴾(البقرۃ:۲۵۶) ''جو طاغوت کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے۔'' اللہ کے سوا جو دوسری محبتیں ہیں ان سب کو مسترد کر دے اور جس کی محبت ایمان لانے کی بدولت ذاتِ باری تعالیٰ پر مرتکز ہو جائے۔ ''پس اُس نے تو اس اصل اور مضبوط سہارے کو تھام لیا''۔ وہ مضبوط کڑا اب اس کے ہاتھ میں آ گیا ہے ''جس کے ٹوٹنے کا کبھی کوئی امکان نہیں'' یہ سہارا چھوٹے گا نہیں۔ یہ اعتماد انسان کو کبھی دھوکہ نہیں دے گا۔ انسان اس کے ساتھ جڑ گیا ہے تو وہ گویا خود اپنی ذات میں ایک چٹان (rock) بن گیا۔ اس چٹان کی بنیاد (rock foundation) ہے حُبِّ الٰہی' محبتِ خداوندی —— البتہ جیسے کہ میں نے عرض کیا' اسی کے ساتھ آ جائے گی محبتِ رسول ﷺ۔

تعمیرِ سیرت وکردار کی بنیادِ ثانی: حُبِّ رسول ﷺ

اس ضمن میں ایک اور بات بھی غور طلب ہے۔ وہ یہ کہ بعض اعتبارات سے لوگوں کی ذہنی سطحوں میں فرق وتفاوت ہے۔ اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جن کی ذہنی سطح بلند نہیں ہوتی اور ان

(۶) اسی طرح لفظ ''مذہب'' قرآن وحدیث میں استعمال نہیں ہوا بلکہ ''دین'' استعمال ہوا ہے جس میں جامعیت اور ہمہ گیری ہے۔ لفظ مذہب میں محدودیت ہے اور یہ لفظ انسان کے محض شخصی معاملات سے بحث کرتا ہے۔ (مرتب)

کے لیے کچھ اور درکار ہوتا ہے۔ جیسے علامہ اقبال مرحوم نے کہا ؎

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر!

تو اس اعتبار سے لوگوں کے فہم وعقل میں فرق وتفاوت ہے' سب کی شعوری سطح (level of consciousness) یکساں نہیں ہے۔ لہٰذا جن لوگوں میں یہ کیفیت زیادہ ہو کہ ع ''خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انسان کی نظر''—— ان کے اعتبار سے محبتِ رسول ﷺ تعمیر سیرت وکردار میں زیادہ مؤثر ہو جاتی ہے بہ نسبت محبتِ الٰہی کے—— اس لیے کہ وہ ان کی ذہنی سطح سے قریب تر ہے۔ اس طرح ایک انسان کی شخصیت کا ہیولا اور ایک انسانی کردار ان کے سامنے آتا ہے' جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ اگر کسی نے کوئی تصور وابستہ کیا تو وہ شرک کے دائرے میں داخل ہو گیا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا کوئی بھی تصور اگر حاشیہ خیال میں آ گیا تو توحید کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ظاہر بات ہے کہ تصور تو ایک ذہنی تخلیق ہے۔ یہ اللہ سبحانہ' وتعالیٰ کا تخیل نہیں بلکہ کوئی اور معبود ہے' جس کو انسانی ذہن نے تراشا ہے۔ بقول شاعر ؎

می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندے دگر
رُست از یک بند تا افتاد در بندے دگر

ذاتِ باری تعالیٰ کا ادراک تو وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے۔ تصور وتخیل سے لات ومنات تراشے جا سکتے ہیں' اللہ جل سبحانہ' کا تخیل وتصور ناممکنات میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کے ادراک سے عاجز ہو جانا ہی دراصل ادراک ہے۔ جیسا کہ فرمایا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے: **اَلْعِجزُ عَنْ دَرَکِ الذَّاتِ اِدْرَاکٌ** اور اس پر گرہ لگائی حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے: **وَالْبَحْثُ عَنْ کُنْہِ الذَّاتِ اِشْرَاکٌ** —— چونکہ وہاں تک رسائی ممکن نہیں لہٰذا بعض لوگوں بلکہ اکثریت کے لیے واقعہ یہ ہے کہ تعمیرِ سیرت کے اعتبار سے محبتِ رسول ﷺ میں تاثیر زیادہ ہے۔ البتہ یہ بات ہر آن مستحضر اور یہ احتیاط ہر لحظہ ملحوظ رکھنے کی ہے کہ اصل محبت' محبتِ الٰہی ہے۔ رسول ﷺ کی محبت اس محبت کے تابع اور اس سے وابستہ (bracketed) ہے۔

تعمیرِ سیرت وکردار کی بنیادِ ثالث: حُبِّ جہاد

ایک مسلمان کی تعمیر کردار کے لیے قوم' وطن اور شخصیتوں کی محبتوں کی جگہ اسلام نے اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی محبت پیش کی ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ سیرت سازی کے لیے

ایک اور مؤثر عامل (factor) ہے کسی نظریے اور آئیڈیالوجی کی محبت‘ یعنی انسان کی محبت اور اس محبت سے سرشار ہو کر دنیا میں ایک عادلانہ و منصفانہ نظام قائم کرنے کی جدوجہد۔ اسلام نے اس کا بھی بھرپور نعم البدل پیش کیا اور اس کا نام رکھا ’’جہاد فی سبیل اللہ‘‘ کی محبت۔ اُس مبنی برقسط اور عادلانہ نظام (اسلام) کو قائم کرنے کا جوش و ولولہ اور محبت‘ جو اللہ کا عطا کردہ دین الحق (نظامِ حیات) ہے: ﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۣ﴾ (آل عمران:۱۹) ’’دین تو اللہ کے نزدیک بس اسلام ہی ہے‘‘۔ اسلام صرف ہمارے مذہبی تصورات اور اعتقادات پر مشتمل نہیں ہے بلکہ یہ ایک مکمل ضابطہ زندگی اور نظامِ حیات ہے‘ جو اجتماعی طور پر پوری نوعِ انسانی کے لیے قسط اور عدل و انصاف کا پورا اہتمام کرتا ہے۔ قرآن حکیم انبیاء ورسل علیہم السلام کی بعثت کا مقصد اسی عدل وقسط کے نظام کو قائم کرنا بھی قرار دیتا ہے‘ جیسے سورۃ الحدید میں فرمایا گیا:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ﴾ (آیت ۲۵)

’’یقیناً ہم نے اپنے رسولوں کو بھیجا روشن نشانیوں (معجزات) کے ساتھ اور ہم نے اُتاری ان کے ساتھ کتاب (دستورِ حیات) اور میزان (نظام وضوابط حیات) تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔‘‘

رسولوں کی بعثت اور انزالِ کتب ومیزان اللہ تعالیٰ کا کوئی کھیل اور مشغلہ (hobby) تو نہیں تھا۔ معاذ اللہ‘ ثم معاذ اللہ! اُس نے اپنی کتابیں (تورات‘ زبور‘ انجیل اور قرآن) اس لیے تو نازل نہیں فرمائی تھیں کہ ان کو محض متبرک اشلوک سمجھ کر پڑھا جائے اور مقدس کتاب سمجھ کر عمدہ سے عمدہ کپڑوں کے غلافوں میں لپیٹ کر طاقوں میں رکھ دیا جائے۔ اور ’’میزان‘‘ یعنی دین الحق‘ شریعت‘ مکمل نظامِ حیات اس لیے تو نہیں اُتارا تھا کہ ہم اس کی مدح سرائی کر لیا کریں‘ اس کی شان میں قصیدے پڑھ لیا کریں۔ اس کی غایت تو یہ ہے کہ: لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ کہ لوگوں کو عدل وانصاف پر کاربند رکھنے کے لیے اس میزان کو نصب کیا جائے اور دین (نظامِ حیات) کو قائم کیا جائے۔ اب عدل وانصاف اور قسط کے اس نظام اور میزان کو قائم اور نصب کرنے کے لیے محنت اور جدوجہد درکار ہے‘ جو انبیاء ورسل کا منصب ہے۔ ان کو اور ان کے اصحاب وحواریین کو رائج شدہ ظالمانہ نظام میں جن لوگوں نے اپنے جائز حق سے زیادہ پر قبضہ کیا ہوا تھا ان سے اس دین اور میزان کے قیام ونصب کے لیے ٹکرانا پڑا۔ ان سے

نبرد آزما ہونے اور ان کی سرکوبی کرنے کے لیے اللہ نے لوہا اُتارا ہے۔ چنانچہ سورۃ الحدید کی اسی آیت میں آگے فرمایا گیا: ﴿وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾ ’’اور ہم نے لوہا بھی اُتارا ہے جس میں جنگ کی شدید ترین صلاحیت ہے اور لوگوں کے لیے (تمدنی ضروریات میں) دوسرے فائدے بھی ہیں‘‘۔ یعنی اسی لوہے سے شمشیر وسناں اور اسلحۂ جنگ تیار ہوتا ہے تو لوگوں کی تمدنی ضروریات اور فائدے کے لیے اسی لوہے سے دوسری بہت سی چیزیں بھی تیار ہوتی ہیں۔ لیکن یہ چیزیں لوہے کے by-products ہیں۔ لوہے کی اصلی قوت جو ہے وہ اسلحۂ جنگ ہے۔ اس ارسالِ رسل‘ انزالِ کتب ومیزان اور انزالِ حدید کی غرض وغایت اسی آیت کے آخر میں بایں الفاظ بیان کی گئی: ﴿وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝۲۵﴾ یہ اس لیے کیا گیا ہے کہ اللہ دیکھ لے کہ کون ہیں اس کے وہ وفادار بندے جو اللہ سے غیب میں رہتے ہوئے اس لوہے کی طاقت کو ہاتھ میں لے کر اللہ اور اس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں‘ یعنی ان کے لائے ہوئے دین اور میزان کو قائم اور نصب کرتے ہیں۔

ہمارے دین نے تعمیر کردار اور سیرت سازی کے لیے اللہ‘ اُس کے رسول ﷺ اور جہاد کی یہ انتہائی قوی اور متحرک (dynamic) محبت عطا فرمائی ہے۔ اس لفظ dynamic پر ذرا غور کیجیے گا کہ اس سے کن تصورات اور کیفیات کی نفی ہوتی ہے۔ میں نے اسی لیے عرض کیا تھا کہ لفظ ’’عشق‘‘ جس میں فراق وہجر میں سوکھنے اور فنافی الشیخ یا فنافی اللہ کے مفاہیم وتصورات شامل ہیں‘ قرآن وحدیث میں کہیں استعمال نہیں کیا گیا۔ اس کی جگہ محبت اور بقا باللہ کا تصور پیش کیا گیا ہے۔ اس حقیقت کو علامہ اقبال مرحوم نے دو اشعار میں بڑی خوبصورتی سے ادا کیا ہے ؎

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات!
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات!

ایک تصوف وہ ہے جو جمود اور بے عملی پیدا کرتا ہے‘ جو معاشرے سے کنارہ کشی کا سبق دیتا ہے۔ جبکہ ایک تصوف وہ ہے جو انسان کو میدانِ عمل میں لاتا ہے‘ جہد وکوشش کا درس دیتا ہے‘ تصادم وقتال کی دعوت دیتا ہے۔ نیکی کا ایک تصور وہ ہے جو راہب خانوں اور بدھ مت کے منڈلوں

میں نظر آئے گا اور نیکی کا ایک تصور وہ ہے جس کے مطابق نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی تربیت بایں طور کی کہ: هُمْ رُهْبَانٌ بِاللَّيْلِ وَفُرْسَانٌ بِالنَّهَارِ ''وہ رات کے راہب اور دن کے شہسوار تھے''۔ ان کی شان یہ تھی کہ ﴿وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ﴾ جناب محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا تصوف تو یہ ہے۔ اس تصوف کا نقشہ کل ڈیڑھ سو سال قبل ہماری سرزمین نے بھرپور دیکھا ہے۔ یہ کوئی ہزار ڈیڑھ ہزار سال پہلے کی بات نہیں۔ دعائیں دیجیے ان مردانِ خود آگاہ اور خدا مست کو جنہوں نے یہ نقشہ آج سے ڈیڑھ سو سال قبل اسی برصغیر میں دکھا دیا تھا۔ مراد ہیں سید احمد شہیدؒ شاہ اسمٰعیل شہید اور ان کے ساتھی مجاہدین۔ رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین۔ انہوں نے سلوکِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا نقشہ پھر ایک بار دنیا کو دکھا دیا تھا۔ اَللّٰهُمَّ نَوِّرْ قُبُوْرَهُمْ وَمَرَاقِدَهُمْ وَاَدْخِلْهُمْ فِي الْجَنَّةِ الْفِرْدَوْسِ۔

یہ ہے محبت کا وہ دوسرا درجہ جو اسلام نے دیا ہے اور جو انسان میں جوشِ عمل کی بجلیاں پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے۔ یہ انقلابی جذبہ ہے، متحرک اور dynamic جذبہ ہے، اور یہ ہے جہاد فی سبیل اللہ کی محبت۔ اب دیکھئے کہ سورۃ التوبہ کی آیت ۲۴ میں، ان تینوں محبتوں کو کس خوبصورتی سے جمع کیا گیا ہے: (۱) اللہ تعالیٰ کی محبت (۲) اس کے رسول ﷺ کی محبت اور (۳) جہاد فی سبیل اللہ کی محبت —— اور انہیں ''مال و دولت دنیا اور رشتہ و پیوند'' پر کس طرح فوقیت دی گئی ہے۔ فرمایا:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۴﴾﴾

''(اے نبی ﷺ! ان سے) کہہ دیجیے کہ اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں (اور بیویوں کے لیے شوہر)، تمہارے رشتہ دار اور وہ مال جو تم نے بہت محنت سے کمائے ہیں، اور وہ تجارت جس کے مندے کا تمہیں خطرہ رہتا ہے، اور وہ مکانات جو تمہیں بہت پسند ہیں، (اگر یہ سب چیزیں) تمہیں محبوب تر ہیں اللہ، اس کے رسول اور اس کے راستے میں جہاد سے، تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ سنا دے۔ اور اللہ ایسے فاسقوں کو راہ یاب نہیں کرتا۔''

اس آیت مبارکہ میں نبی اکرم ﷺ کو دعوت دی گئی ہے کہ آپؐ اہلِ ایمان سے کہیں کہ وہ اپنی

محبتوں کا جائزہ لے لیں۔ اس لیے کہ زندگی کا سارا کھیل تو محبت ہی کا ہے، جس میں علائقِ دنیا اور مال و زر کی محبت بڑی قوی محبت ہے۔

منفی اور ہوائے نفس کی محبتوں سے پرہیز

انسانیت مال و دولتِ دنیا کی محبت کی خاطر ٹھوکریں کھاتی نظر آ رہی ہے، انسان باطل کے آگے سرنگوں ہے۔ اس محبت میں اپنے شرفِ آدمیت، اپنے وقار، اپنی خودی اور اپنی عزت کا سودا کرنے والے لوگ دنیا میں ہر سُو نظر آ رہے ہیں۔ اپنے ضمیر کو کچلنے اور اس کا گلا گھونٹ دینے والے لوگ چہار سُو پھیلے ہوئے ہیں۔ مال و زر، شہرت و وجاہت اور شہوات کی محبتیں انسان کی ہوائے نفس سے متعلق ہیں، جو انتہائی گھٹیا اور پست و ادنیٰ محبتیں ہیں۔ وطن و قوم کی محبت ان نفسانی محبتوں سے یقیناً بلند و برتر محبت ہے، اس کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ جیسے کہ میں نے کئی مرتبہ عرض کیا ہے کہ فرقِ مراتب ضروری ہے ع ''نہ ہر زن زن است و نہ ہر مرد مرد''۔ نہ اہلِ ایمان سب برابر کے تھے اور نہ اہل کفر سب برابر کے تھے۔ اہلِ کفر میں ابو طالب بھی تھے اور ابولہب بھی تھا۔ کفر مشترک ہے مگر سیرت و کردار کا فرق صاف نمایاں ہے۔ اہلِ ایمان میں ابو بکر صدیق، عمر فاروق، عثمانِ ذوالنورین، علی حیدر اور دیگر اصحابِ عشرہ مبشرہ بھی تھے، اصحابِ بدر بھی، اصحابِ بیعت رضوان بھی تھے اور عام صحابہ کرام بھی تھے۔ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین
ع ''گر حفظِ مراتب نہ کنی زندیقی!''

تو محبتوں کے معاملے میں ع ''پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے!'' کے مصداق اگر انتہائی پستی والی محبت دیکھنی ہو تو وہ ہے: ''محبتِ ذات'' —— اپنے ہی حریمِ ذات کا طواف اور اپنے ہی حریمِ ناز پر پروانہ وار نثاری —— اپنی دولت، اپنا مال و زر، اپنی شہرت و وجاہت، اپنی عزت و وقار، اپنا نام و نمود، اپنی خواہشات، اپنا عیش و آرام، اپنی آرائش و زیبائش —— ان ہی محبتوں کے ہم سب اسیر ہیں اور اسی چکر میں پھنسے ہوئے ہیں۔ الا ماشاء اللہ، شاذ ہی بلکہ آٹے میں نمک کی نسبت سے بھی قلیل ایسے خوش نصیب اور اللہ والے لوگ ہوں گے جو اس سطح سے بلند ہوں۔ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی محبت اور اس کی راہ میں جدوجہد اور محنت و کوشش، ایثار و قربانی تو بہت اُونچی بات ہے۔ میں نے اس نفسانی محبت سے بالاتر جو محبتیں گنوائیں، یعنی وطن و قوم کی محبت اور کسی نظریے اور نصب العین کی محبت تو ہماری عظیم اکثریت کی تو یہاں تک بھی رسائی نہیں ہے، جبکہ ان محبتوں پر بھی ایک سیرت تعمیر ہو جاتی ہے اور ایک وطن پرستانہ کردار،

ایک قوم پرستانہ کردار اور ایک انقلابی اور مجاہدانہ کردار وجود میں آ جاتا ہے‘ جس کے نقشے ہمیں دنیا میں نظر آتے ہیں۔ خلاتو ہمارے یہاں ہے کہ یہاں کوئی محبت ہی نہیں‘ سوائے اپنی محبت کے۔ اپنی ہی ذات کعبہ ہے جس کا ہم طواف کر رہے ہیں۔ اپنے ہی مفادات ہم کو سب سے زیادہ عزیز اور محبوب ہیں اور ہماری ساری تگ و دو اور دوڑ دھوپ اپنی ذات ہی کے گرد گھوم رہی ہے‘ اِلا ماشاءاللہ!

اب آپ دیکھئے کہ قرآن مجید میں ہمیں کس طرح ان محبتوں کا جائزہ لینے کا سبق دیا گیا ہے۔ سورۃ التوبہ کی آیت ۲۴ میں اس جائزہ کے لیے ہمارے سامنے ایک کسوٹی اور ایک معیار رکھا گیا ہے۔ اب میں اس کی ترجمانی اور شرح و تفصیل پیش کرتا ہوں۔ فرمایا: اے نبیﷺ! کہہ دیجئے کہ اے ایمان لانے والو! اپنی محبتوں کا جائزہ لے لو اور اپنے باطن میں ایک ترازو نصب کرو۔ ایک پلڑے میں آٹھ محبتیں ڈالو (۱) اپنے باپوں کی محبت‘ (۲) بیٹوں کی محبت‘ (۳) بھائیوں کی محبت‘ (۴) بیویوں کی محبت (ماں‘ بیٹی‘ بہن اور شوہر کی محبت انہی محبتوں کے تابع ہیں)‘ (۵) رشتہ داروں اور اعزہ و اقارب کی محبت۔ یہ وہ پانچ محبتیں ہیں جو علائق دنیوی سے متعلق ہیں‘ (۶) اُس مال کی محبت جو بڑے چاؤ سے جمع کیا ہے‘ (۷) اُس کاروبار کی محبت جو بڑی محنت سے تم نے جمائے ہیں‘ جس میں تمہارا خون پسینہ شامل ہے اور جس کے متعلق تم گھبراتے رہتے ہو کہ کہیں ماند نہ پڑ جائے‘ کہیں گھاٹا نہ ہو جائے‘ کہیں کساد بازاری نہ آ جائے‘ اور (۸) اُن مکانوں کی محبت جو تم نے بڑے ارمانوں سے بنائے ہیں اور ان کی آرائش و زیبائش میں پانی کی طرح پیسہ بہایا ہے۔ یہ تین محبتیں اسباب و سامانِ دُنیوی سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ کل آٹھ محبتیں ہوئیں۔ اب سب کو ترازو کے ایک پلڑے میں ڈالو اور دوسرے پلڑے میں تین محبتیں: (۱) اللہ کی محبت‘ (۲) اُس کے رسولﷺ کی محبت‘ اور (۳) اُس کی راہ میں جہاد کی محبت‘ جو بڑی dynamic محبت ہے‘ ڈالو۔ اب دیکھو کہ کون سا پلڑا جھکا؟ اگر علائق اور ساز و سامانِ دنیوی کی آٹھ محبتیں تمہارے قلب پر زیادہ مسلط ہیں ان تین محبتوں یعنی اللہ‘ رسول اور جہاد کی محبتوں سے اور پہلا پلڑا جھک گیا تو جاؤ دفع ہو جاؤ۔ ﴿فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِہٖ ؕ وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ﴿۲۴﴾﴾ ”پس جاؤ اور گومگو اور انتظار کی حالت میں مبتلا رہو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے۔ اور اللہ ایسے فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔“

یہ ہیں ایک مسلم و مؤمن بندے کی تعمیر سیرت و کردار کی مثبت اساسات: اللہ کی محبت‘

رسول اللہﷺ کی محبت‘ اور جہاد کی dynamic محبت۔ یہ تین محبتیں اگر موجود ہیں تو یوں سمجھئے کہ تعمیر سیرت کا بنیادی پتھر (corner stone) یعنی جڑ اور بنیاد‘ اذہان و قلوب میں موجود ہے۔(۷)

(جاری ہے)

---

(۷) ”عشق“ کا لفظ اگرچہ قرآن و حدیث میں کہیں نہیں آیا‘ لیکن فارسی اور اردو شاعری میں عام طور پر اس محبت کے لیے ”عشق“ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا دیکھئے کہ ہمارے دو عارفین نے محبت خداوندی کو کس طرح تعبیر کیا ہے۔ مولانا رومی فرماتے ہیں:

شاد باد اے عشقِ خوش سودائے ما
اے طبیبِ جملہ علّت ہائے ما!

اور علامہ اقبال فرماتے ہیں:

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اوّلیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

اور

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں‘ راکھ کا ڈھیر ہے!

اور

صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق‘ صبر حسینؓ بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق!

(مرتب)

خلافت کی حقیقت، تاریخی پس منظر، عہد حاضر میں
اس کا ڈھانچہ اور اس کے قیام کے نبویؐ طریق پر مشتمل

خلافت کی حقیقت
اور عصرِ حاضر میں اس کا نظام

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

اشاعت خاص 200 روپے، اشاعت عام 120 روپے

قرآنِ کریم کی اُصولی باتیں (۱۴)

پروفیسر ڈاکٹر عمر بن عبداللہ المقبل

ترجمہ: ابوعبدالرحمٰن شبیر بن نور

۴۲واں اصول:

﴿وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ﴾

''اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو!''

یہ قرآنِ کریم کا ایک مضبوط اصول ہے' جس کا لوگوں کی زندگی سے بہت گہرا تعلق ہے۔ لوگوں کا کثرت کے ساتھ اس میں ملوث ہونے کی وجہ سے ضروری تھا کہ لوگوں کو یاددہانی کروا دی جائے کہ یہ بہت اہم معاملہ ہے' جسے اللہ تعالیٰ نے اس طرح فرمایا ہے: ﴿وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ۭ﴾ (المائدۃ:۸۹) ''اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو۔''

سورۃ المائدۃ میں قسم کے کفّارے کے پس منظر میں قرآنِ کریم کا یہ محکم اصول بیان ہوا ہے' جسے ہم یہاں بیان کر رہے ہیں کہ: ﴿وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ۭ﴾ (المائدۃ:۸۹) ''اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو''۔ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اپنی قسموں کو تین چیزوں سے محفوظ رکھو:

پہلی بات: اللہ تعالیٰ کے نام کی جھوٹی قسم کھانے سے پرہیز کرو۔

دوسری بات: کثرت کے ساتھ قسم کھانے سے پرہیز کرو۔

تیسری بات: جب انسان قسم کھالے تو پھر توڑنے سے پرہیز کرے۔ ہاں اگر قسم توڑنا ہی بہتر ہو تو پھر حفاظت کی شکل یہ ہے کہ بہتر کام کو کر لیا جائے' اور یہ قسم اُس بہتر کام کو چھوڑنے کی وجہ نہ بنے' جس کو نہ کرنے کی اس نے قسم کھائی تھی۔

ان سب باتوں کی تفصیلات درجِ ذیل میں آ رہی ہیں۔

جھوٹی قسم کھانے سے باز رہنا چاہیے' اس لیے کہ جھوٹی قسم کھانا سب سے بڑے گناہوں

میں سے ہے۔ اِسی کو ''یمین غموس'' بھی کہا جاتا ہے' یعنی جو قسم اُٹھانے والے کو گناہ میں ڈبو دیتی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو بن العاص ﷠ بیان کرتے ہیں کہ ایک اَعرابی (دیہاتی آدمی) نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا' اُس نے پوچھا: یارسول اللہ! کون کون سے گناہ ''کبائر'' ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَلْاِشْرَاكُ بِاللّٰهِ)) ''اللہ کے ساتھ شرک کرنا''۔ اُس نے دریافت کیا: اس کے بعد کونسا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ((عُقُوْقُ الْوَالِدَيْنِ)) ''والدین کی نافرمانی کرنا''۔ اس نے پوچھا: پھر کونسا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَلْيَمِيْنُ الْغَمُوْسُ)) ''جھوٹی قسم کھانا''۔ میں نے دریافت کیا: ''یمینِ غموس'' کیا ہوتی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَلَّذِىْ يَقْتَطِعُ مَالَ امْرِئٍ مُسْلِمٍ هُوَ فِيْهَا كَاذِبٌ)) (صحیح البخاری' ح ۶۵۲۲) ''جو شخص جھوٹی قسم کے ذریعے کسی مسلمان کا مال ہڑپ کرلے''۔

قسم کی حفاظت کا معاملہ بہت واضح ہونے اور جھوٹی قسم کے بارے میں شدید وعید ہونے کے باوجود انتہائی پریشان کن بات ہے کہ بعض لوگ محض دنیوی فائدے کی خاطر یا جھوٹ اور حیلے بازی کی وجہ سے آنے والی پریشانی کو اپنی جان سے دور کرنے کی خاطر جھوٹی قسم کھا لیتے ہیں۔ کیا ان لوگوں کو اس بات کی خبر نہیں کہ آخرت کے عذاب کے مقابلے میں دنیا کی سزا بہت معمولی چیز ہے؟ کیا ان لوگوں نے نبی اکرم ﷺ کے اُس فرمان کو نہیں سنا جس کی وجہ سے دل کانپ اُٹھتا ہے' آپ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ حَلَفَ عَلٰى يَمِيْنِ صَبْرٍ يَقْتَطِعُ بِهَا مَالَ امْرِئٍ مُسْلِمٍ [هُوَ فِيْهَا فَاجِرٌ] لَقِيَ اللّٰهَ وَهُوَ عَلَيْهِ غَضْبَانُ)) (صحیح مسلم، ح ۲۲۰)

''جس کسی نے جھوٹی قسم کھائی تاکہ اس کے ذریعے کسی مسلمان کا مال ہڑپ کر سکے (اور وہ اس طرح گناہ کما رہا تھا)' وہ جب اللہ کے ہاں حاضر ہوگا تو اللہ تعالیٰ اس سے شدید ترین ناراض ہوگا۔''

جھوٹی قسم کو ''یمین صبر'' اس لیے کہا جاتا ہے کہ قسم اُٹھانے والا اپنے آپ کو اس کے ساتھ باندھ لیتا ہے۔ اسی قسم کو ''الیمین الغموس'' بھی کہا جاتا ہے' اس لیے کہ یہ قسم بندے کو گناہ میں ڈبو دیتی ہے۔

بہت زیادہ قسم کھانے سے قسم کی حفاظت کرنے کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس اصول کے حوالے سے فرماتے ہیں: ﴿وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ۭ﴾ (المائدۃ:۸۹) ''اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو''۔ اس کا معنی ہے کہ کم سے کم قسم کھاؤ۔ اور جو بہت زیادہ قسمیں کھاتا ہے اللہ تعالیٰ

نے اس کی مذمت کی ہے‘ فرمایا:﴿وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ﴿١٠﴾﴾ (القلم) ’’بہت زیادہ قسمیں کھانے والے بے وقار آدمی کی بات نہ ماننا۔‘‘

کم کم قسمیں کھانے کے حکم میں درجِ ذیل حکمتیں پوشیدہ ہیں:

۱- بندے کے دل میں اللہ کی عظمت جس قدر زیادہ ہوگی اسی قدر اس کی عبودیت (بندگی) مکمل ہوگی۔ کمالِ تعظیم کا مقام تو یہ ہے کہ اُس کے نزدیک اللہ کا ذکر بلند و بالا ہو‘ نہ کہ دنیاوی مفاد کے لیے اُس ذات کا نام استعمال ہو۔

۲- بہت زیادہ قسمیں کھانے والے کا اعتماد اپنی جان پر اور لوگوں کا بھی اُس کی ذات پر بہت کمزور ہوتا ہے۔ اُسے احساس ہوتا ہے کہ اُس پر بھروسہ نہیں کیا جائے گا‘ لہٰذا وہ قسم اُٹھاتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اُسے ’’بے وقار‘‘ کہا ہے۔ لہٰذا والدین اور تربیت کرنے والوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کوتاہی کی طرف متوجہ رہیں جس کا بہت سارے لوگ شکار ہو جاتے ہیں۔ ضرورت یہ ہے کہ وہ اپنے زیرِ تربیت لوگوں کو اللہ کی تعظیم کرنا سکھائیں‘ اور اللہ کی تعظیم کی ایک شکل یہ ہے کہ انہیں بلاضرورت کثرت کے ساتھ اللہ کی قسم کھانے سے روکیں۔

۳- قسم کو توڑنے سے بچنا (جس کام کی قسم کھائی ہو اُس کی خلاف ورزی کرنا)۔ جب کوئی مؤمن بندہ نیک یا مباح کام کی قسم کھالے تو اس کی ذمہ داری ہے کہ اللہ سے ڈرے اور اپنی قسم کو پورا کرے۔ اِس لیے کہ جس ذات کی قسم کھائی گئی ہے یہ اُس کی عظمت اور مقام کی بات ہے‘ اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات ہے۔

صرف ایک صورت اس میں سے مستثنیٰ ہے‘ جب کہ قسم پر عمل کرنے کے مقابلے میں اسے توڑنا اور اس کے اُلٹ کام کرنا بہتر ہو۔ اِس موقع پر قسم کی حفاظت کی شکل یہ ہے کہ بہتر کام کو کرلیا جائے اور جس کام کو چھوڑنے کی اس نے قسم کھائی تھی وہ نیک کام اس قسم کی وجہ سے نہ رہ جائے۔ مثلاً: اُس نے قسم کھالی کہ وہ فلاں چیز نہیں کھائے گا یا فلاں آدمی کے گھر میں داخل نہیں ہوگا۔ اس موقع پر افضل یہ ہے کہ وہ اپنی قسم پر قائم نہ رہے‘ بالخصوص جب کہ قسم توڑنا ہی زیادہ بہتر ہو۔ اس کی دلیل آپ ﷺ کا یہ فرمان ہے:

((مَنْ حَلَفَ عَلٰى يَمِيْنٍ فَرَاٰى غَيْرَهَا خَيْرًا مِنْهَا فَلْيَاْتِهَا وَلْيُكَفِّرْ عَنْ يَمِيْنِهٖ)) (صحیح مسلم، ح ۱۶۵۰)

’’جس نے قسم کھائی‘ پھر اُس نے اُس کے خلاف کام کو بہتر پایا تو وہ بہتر کام کو کرلے اور

اپنی قسم کا کفارہ ادا کردے۔‘‘

کہنے کی بات یہ ہے کہ ہم اس قرآنی اصول پر اچھی طرح غور کریں:﴿وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ؕ﴾ ’’اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو‘‘ کہ ہم جھوٹی قسمیں کھانے سے بچیں‘ بلاضرورت بہت زیادہ قسم کھانے سے پرہیز کریں‘ اور قسم توڑنے سے احتیاط کریں‘ الا یہ کہ قسم پر عمل کرنے کی بجائے اُسے توڑنا زیادہ بہتر ہو۔

۴۳واں اصول:

﴿وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝﴾

’’اور جو کوئی بھی اپنے نفس کے بخل سے بچایا گیا پس وہی لوگ کامیاب بامراد ہیں۔‘‘

قرآنِ کریم کا یہ مضبوط اصول اخلاق کے باب سے ہے۔ اِس کا تعلق دل کی اِصلاح اور اُس کو پاک کرنے سے ہے‘ اور اس کا تعلق انسانوں کے باہمی رابطے سے بھی ہے۔ اس اصول کی وضاحت بیان کرنے سے پہلے ہم لفظِ ’’شُحّ‘‘ کے معنیٰ کو سمجھ لیں۔ اس کے معنی ہیں: ’’شدید لالچ کی وجہ سے خرچ کرنے اور عطا کرنے سے رک جانا‘‘۔ چونکہ ’’شُحّ‘‘ کی بنیاد نفس میں ہوتی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے نفس کی طرف منسوب کیا ہے‘ فرمایا:﴿وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ﴾۔ اس کا یہ معنیٰ بھی نہیں ہے کہ اس سے جان خلاصی نہیں کروائی جاسکتی۔ جس کے لیے اللہ تعالیٰ آسان فرمادے‘ اس کے لیے اس سے خلاصی کروانا آسان ہے۔ البتہ ظاہری و معنوی ہر دو شکل میں مکمل خلاصی صرف کامیاب لوگوں کو ہی مل سکتی ہے۔ روایت میں آیا ہے کہ سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ طواف کرتے ہوئے یہ دعا فرما رہے تھے: رَبِّ قِنِيْ شُحَّ نَفْسِيْ! رَبِّ قِنِيْ شُحَّ نَفْسِيْ! ’’اے میرے رب! مجھے نفس کی بخیلی سے بچا‘ اے میرے ربّ! مجھے نفس کی بخیلی سے بچا‘‘۔ بار بار یہی بات دہرا رہے تھے‘ اور کچھ نہیں کہہ رہے تھے۔ جب اُن سے اس بارے میں پوچھا گیا؟ تو فرمایا: ’’جب مجھے نفس کی بخیلی سے بچا دیا گیا تو نہ میں چوری کروں گا‘ نہ زنا کروں گا‘ نہ کوئی (اور برا) کام کروں گا‘‘۔ اللہ تعالیٰ کے کلام کے معانی سمجھنے میں سلف صالحین اور بالخصوص صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی گہرائی عجیب چیز تھی۔

یہاں ایک چیز قابل غور ہے‘ کہ اس موضوع کو مال کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے اور یہ بات

بھی واضح ہے کہ کنجوسی کا تعلق مال سے ہی ہوا کرتا ہے۔ لیکن کنجوسی کا تعلق صرف مال سے نہیں ہوتا۔ جس موضوع پر ہم گفتگو کر رہے ہیں' اس میں اس اصول کو عملی مثالوں کے ذریعے ہم اس طرح واضح کر سکتے ہیں :

۱- جو بات سورۃ الحشر نے واضح کی ہے' فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۭ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۹﴾

''اور (ان کے لیے) جنہوں نے اس گھر (یعنی مدینہ) میں اور ایمان میں ان سے پہلے جگہ بنا لی ہے اور اپنی طرف ہجرت کر کے آنے والوں سے محبت کرتے ہیں' اور مہاجروں کو جو کچھ دے دیا جائے اس سے وہ اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہیں رکھتے' بلکہ خود اپنے اوپر انہیں ترجیح دیتے ہیں' گو خود کو کتنی ہی سخت حاجت ہو۔ اور جو کوئی بھی اپنے نفس کے بخل سے بچا لیا گیا تو وہی لوگ کامیاب اور بامراد ہیں۔''

یہ بہت بڑے مقام کی بات ہے' جس کی تعریف اللہ تعالیٰ نے ان انصار کے بارے میں کی ہے جنہوں نے اپنے دل اور گھر مہاجر صحابہ کرام کے لیے کھول دیے تھے' رضی اللہ عنہم اجمعین۔ حالانکہ انصارِ صحابہ کی بہت بڑی آبادی تنگ دست تھی۔ اللہ تعالیٰ کی علیم وخبیر ذات جو دل کی گہرائی میں موجود بات کو بھی جانتی ہے' اُس کی طرف سے ایسی تعریف کا آنا بہت بڑی بات ہے۔ ان دلی اعمال پر غور کر لو جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اطلاع دی ہے' ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل بخیلی و کنجوسی سے پاک تھے۔

پہلا کام: ''وہ پسند کرتے ہیں'' جب کہ عام طور پر صورتِ حال یہ ہوتی ہے کہ جب لوگ قبائل کی طرف ہجرت کر کے جاتے ہیں وہ ان سے تنگ ہو جاتے ہیں۔

دوسرا کام: ''اور مہاجروں کو جو کچھ دے دیا جائے' اس سے وہ اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہیں رکھتے''۔ اس لیے کہ اگر یہ تنگی انصار کے دلوں میں ہوتی تو لازماً مہاجر صحابہ ؓ اسے محسوس کر لیتے۔

تیسرا کام ایثار کا ہے' یعنی کسی دوسرے کو فائدے یا عزت واحترام میں ترجیح دینا۔ یعنی وہ اپنے اختیار سے دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں' بھلے ان کو خود بھی کتنی ضرورت رہی ہو۔

۲- اس اصول کی عملی شکل:

﴿وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۹﴾ (الحشر)

''(بات یہ ہے کہ) جو کوئی بھی اپنے نفس کے بخل سے بچا لیا گیا تو وہی لوگ کامیاب اور بامراد ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے ایثار کرنے والے انصار صحابہ کرام ؓ اور جو لوگ اس عظیم کردار میں ان کے نقش قدم پر چلے' ان سب کی تعریف فرمائی ہے۔ ''مدارج السالکین الی ربّ العالمین'' نامی کتاب میں امام ابن القیم رحمہ اللہ نے ایثار کو اُن منزلوں میں سے ایک منزل قرار دیا ہے جو بندے کو اللہ تعالیٰ کے قریب کرنے والی ہیں۔

ایثار کیا ہوتا ہے؟ ایثار کنجوسی کی ضد ہے کہ بندہ جس چیز کا خود محتاج ہوتا ہے وہی چیز وہ دوسرے کو دے دیتا ہے۔ اور کنجوس آدمی' جو چیز اس کے پاس نہیں ہوتی' اس کا لالچ کرتا ہے اور جب مل جاتی ہے تو اس کے بارے میں کنجوسی کرتا ہے اور دوسرے کو دینے میں بخل کرتا ہے۔ بخیلی کنجوسی کا نتیجہ ہوا کرتی ہے اور کنجوسی بخیلی کا حکم دیتی ہے۔

۴۴واں اصول:

﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۤ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ﴾

''اور تمہیں رسول (ﷺ) جو کچھ دیں اسے لے لو اور جس چیز سے روکیں اس سے رک جاؤ!''

یہ سب سے بڑا اُصول ہے جو دل کو اللہ ربّ العالمین کی بندگی پر قائم رہنے پر مددگار بنتا ہے اور اُس کے سامنے تسلیم ورضا پر کاربند رہنے کی تربیت کرتا ہے۔ یہی اصول واضح طریقے سے بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں پر رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کو فرض قرار دیا ہے' اور کسی کو استثناء حاصل نہیں ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۤ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ﴾ (الحشر:۷)

''اور تمہیں رسول (ﷺ) جو کچھ دیں اسے لے لو اور جس چیز سے روکیں اس سے رک جاؤ!''

ہمیشہ سے علماء کرام نے علم ودین کے تمام ابواب میں اس اصول سے استدلال کیا ہے۔

کتبِ عقیدہ تحریر کرنے والوں نے شرعی احکام کو ماننے اور تسلیم کرنے میں اس اُصول کو بنیاد بنایا ہے، خواہ شرعی احکام کے معانی کسی عاقل بالغ کو نہ سمجھ آتے ہوں یا اس کے معانی سمجھنے میں مشکل ہو رہی ہو۔ نیز فقہ کے ابواب دیکھ لیں، صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین سے لے کر آج تک کے مفتی اِسی اصول سے استدلال کرتے ہوئے کسی کام کے کرنے یا کسی کام سے منع کا حکم دیتے ہیں۔

مثال: ایک تابعی نے کسی ''مُحرِم'' (جس شخص نے حج یا عمرے کی نیت سے دو سادہ چادروں کا احرام باندھا ہو) کو عام کپڑوں میں دیکھا تو اس کو سخت لفظ کہہ دیا، اس پر اس محرم نے کہا: مجھے کتاب اللہ سے دلیل دو کہ مجھے اپنے کپڑے اتارنے ہیں۔ اُس تابعی نے یہ آیت پڑھ کر سنا دی:

﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ﴾ (الحشر:۷)

''اور تمہیں رسول (ﷺ) جو کچھ دیں اسے لے لو اور جس چیز سے روکیں اس سے رک جاؤ!''

جو شخص صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے حالات پر غور کرے تو اُنہیں دل کی رضا اور فوراً قبول کرنے والے نفوس کے ساتھ احکام و نواہی کو قبول کرنے میں بہت اونچے مقام پر پائے گا۔ اُن کی لغت میں چونکہ، چنانچہ، کیوں اور کیسے نہیں تھا اور وہ یہ بھی نہیں پوچھتے تھے کہ یہ کام حرام ہے یا مکروہ ہے؟ یا یہ حکم واجب ہے یا مستحب ہے؟ بس بات سنی اور حکم کے مطابق عمل کر دیا اور اس دین کو پوری طاقت و ہمت سے انہوں نے سنبھالا، اسی وجہ سے ان کا مقام عام مسلمانوں سے بہت عظیم اور اونچا ہے۔

بعد کی صدیوں میں لوگوں میں بہت زیادہ تحقیق اور سوال کا مزاج آ گیا اور وہ یہ پوچھنے لگے کہ کیا یہ حکم واجب ہے یا مستحب ہے؟ اور کیا یہ مکروہ ہے یا حرام ہے؟ نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام اور ممنوعات پر عمل کمزور ہو گیا، اللہ کی بندگی بھی ڈھیلی پڑ گئی اور مکمل اطاعت مشکل لگنے لگی۔

میں اس بات کا دعویٰ نہیں کرتا ہوں کہ شرعی احکام واجب و مستحب میں تقسیم نہیں ہوتے، یا ممنوع کام حرام و مکروہ میں تقسیم نہیں ہوتے، اور اس بات کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جب کوئی غلطی ہو جائے تو حالات کے مطابق اس کی تفصیل کی ضرورت ہوا کرتی ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کے

حکم کو واضح کیا جا سکے اور اس باب میں جو کوئی سزا یا کفارہ بنتا ہو، اس کو بیان کیا جا سکے۔ لیکن افسوس کا مقام یہ ہے کہ عام طور پر اس طرح کی تقسیمات پوچھنے والوں کا مقصد علم حاصل کرنا یا مسائل کی تحقیق نہیں ہوا کرتا، بلکہ ایسے لوگ حکم پر عمل سے فرار اور جان چھڑانا چاہتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کی طرف اس قرآنی محکم اصول کی ندا آئی ہے:

﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ﴾ (الحشر:۷)

''اور تمہیں رسول (ﷺ) جو کچھ دیں اسے لے لو اور جس چیز سے روکیں اس سے رُک جاؤ!''

۴۵واں اصول:

﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ۭ﴾

''یقیناً نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔''

یہ محکم قرآنی اصول ہے، جس کی ہر مؤمن کو ضرورت ہوتی ہے، بالخصوص وہ آدمی جو توبہ کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اور اپنے رب کی طرف آنے کا پختہ ارادہ کر چکا ہے۔ یہ اُصول سورۂ ہود کی ایک آیت میں بیان ہوا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ۭ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ۭ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ١١٤؁﴾

''دن کے دونوں سروں پر نماز کو قائم رکھ اور رات کی کئی ساعتوں میں بھی۔ یقیناً نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔ یہ نصیحت ہے نصیحت پکڑنے والوں کے لیے۔''

جس آیت میں یہ اصول اختصار کے ساتھ بیان ہوا ہے اس کے معانی یہ ہیں: اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ کو مخاطب ہو کر فرما رہے ہیں اور آپ ﷺ ساری امت سے مخاطب ہو رہے ہیں کہ: دن کے دونوں کناروں پر نماز قائم کرو اور رات کو بھی نماز پڑھو کہ بندہ اپنے قدم جما کر اللہ کے حضور کھڑا ہو جائے۔ پھر اس حکم کا فائدہ بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ۭ﴾ (ھود:۱۱۴) ''یقیناً نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں''۔ برائیاں اور گناہ بندے سے اس طرح دور ہو جاتے ہیں جیسے کہ تھے ہی نہیں۔

گناہ دور کرنے میں دو باتیں شامل ہو جاتی ہیں:

۱- گناہ سرزد ہی نہ ہوں‘ کہ دل گناہوں کی طرف مائل ہی نہ ہو‘ اور گناہوں سے نفرت ہو جائے۔ اس کیفیت میں گناہوں کو چھوڑنا نفس کے لیے انتہائی آسان ہو جاتا ہے‘ جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَلٰـکِنَّ اللّٰہَ حَبَّبَ اِلَیۡکُمُ الۡاِیۡمَانَ وَزَیَّنَہٗ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ وَکَرَّہَ اِلَیۡکُمُ الۡکُفۡرَ وَالۡفُسُوۡقَ وَالۡعِصۡیَانَ ؕ﴾ (الحجرات:۷)

’’لیکن اللہ تعالیٰ نے ایمان کو تمہارے لیے محبوب بنا دیا ہے اور اُسے تمہارے دلوں میں زینت دے رکھی ہے اور کفر کو‘ گناہ کو اور نافرمانی کو تمہاری نگاہوں میں ناپسندیدہ بنا دیا ہے۔‘‘

اور تمام نیکیوں میں یہ خوبی پائی جاتی ہے۔

۲- اور یہ خوبی بھی ہے کہ جب گناہ ہو جائے تو نیکی اس گناہ کو دھو دیتی ہے‘ اور یہ خوبی بھی تمام نیکیوں میں پائی جاتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا اپنے نیک بندوں پر احسان ہے۔

﴿اِنَّ الۡحَسَنٰتِ یُذۡہِبۡنَ السَّیِّاٰتِ ؕ﴾ (ھود:۱۱۴) ’’یقیناً نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں‘‘ پر مشتمل محکم اصول کی وضاحت کرنے والی عملی مثالیں تو بہت زیادہ ہیں‘ بطور مثال ہم یہاں چند ایک کا ذکر کریں گے۔ اِن میں سب سے پہلی تو وہی مثال ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ کریمہ میں بیان کیا ہے جس کے حوالے سے یہ اصول بیان ہوا ہے۔

۱- دن کے دونوں کناروں میں نماز قائم کرنا‘ یعنی دن کے شروع میں اور آخر میں‘ اور رات کے کچھ حصوں میں۔ بلاشبہ اِس حکم میں سب سے پہلے تو پانچوں نمازیں شامل ہوں گی‘ نیز دوسری نفل نمازیں بھی شامل ہو جائیں گی‘ جیسے سنتِ مؤکدہ اور تہجد وغیرہ۔

یہ آیت کریمہ بتا رہی ہے کہ فرض نمازیں اور نفل نمازیں ایسی عظیم نیکیاں ہیں کہ جن کی وجہ سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور یہی بات سنتِ مطہرّہ میں وضاحت کے ساتھ بیان ہوئی ہے (جس کی تفصیل گزر چکی ہے) بشرطیکہ کبیرہ گناہوں سے بچا جائے۔

جو لوگ فرض اور نفل نمازوں کا اہتمام کرتے ہیں اُن کے لیے خوشخبری ہے کہ انہیں اس قرآنی اصول سے وافر حصہ ملے گا: ﴿اِنَّ الۡحَسَنٰتِ یُذۡہِبۡنَ السَّیِّاٰتِ ؕ﴾ (ھود:۱۱۴) ’’یقیناً نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں‘‘۔ اور جو لوگ فرض نمازوں کے تارک ہیں وہ کتنے بڑے گھاٹے اور خسارے میں ہیں۔

۲- اس آدمی کا قصہ بہت مشہور ہے جس نے ننانوے (۹۹) آدمیوں کا قتل کیا اور توبہ کر لی۔ دلیل یہ ہے کہ جب وہ آدمی برائی کے علاقے سے نکل کر اچھائی کے علاقے کی طرف سفر کرنے لگا تو اس کی موت کا وقت آ گیا۔ اَب رحمت اور عذاب کے فرشتے اُس کے بارے میں جھگڑا کرنے لگے۔ رحمت کے فرشتوں نے کہا: یہ آدمی توبہ کر کے آیا ہے اور اللہ کی طرف اس کی توجہ ہے۔ عذاب کے فرشتوں نے کہا: اس نے کوئی اچھا کام نہیں کیا۔ اس موقع پر ایک فرشتہ انسانی شکل میں ظاہر ہوا‘ رحمت اور عذاب کے فرشتوں نے اُس کو اپنے درمیان فیصلہ کرنے والا بنا لیا۔ اُس نے کہا: دونوں علاقوں کا راستہ ماپ لو‘ جس کے قریب ہو اُسی کا شمار ہو گا۔ فرشتوں نے دونوں طرف کا راستہ ماپا تو وہ اس زمین کے زیادہ قریب تھا جدھر وہ جا رہا تھا‘ چنانچہ رحمت کے فرشتوں نے اس کی روح کو قبض کیا۔ (صحیح البخاری/ح ۳۴۸۳ و صحیح مسلم/ح ۲۷۶۶)

ہماری دعوت ہے ہر اُس شخص کے نام جس نے اپنی ذات پر ظلم کیا ہو اور شیطان نے اس کو اپنے رب کی رحمت سے مایوس کر دیا ہو‘ کہ ہرگز مایوس نہ ہونا اور نہ کبھی نااُمید ہونا۔ اِس شخص کے واقعے پر غور کرو جس نے ننانوے (۹۹) قتل کیے تھے‘ جب اس کی توبہ قبول ہو سکتی ہے‘ اُس پر اُس کا رب اور مولیٰ رحمت کر سکتا ہے‘ حالانکہ اس نے اپنے جسم کے ذریعے کوئی نیک کام نہیں کیا‘ بس اُس نے برے علاقے سے نیک علاقے کی طرف ہجرت کی (پھر کوئی وجہ نہیں کہ اُس کی توبہ تو قبول ہو اور تمہاری نہ ہو!) کیا ایسے ایمان افروز واقعے نے تمہارے اندر گناہوں کو چھوڑنے کا جذبہ پیدا نہیں کیا؟ اور نہ ہی اُس ذات کی طرف متوجہ ہونے کا جذبہ پیدا کیا‘ جس ذات کے علاوہ نہ کہیں سے خوش قسمتی مل سکتی ہے اور نہ ہی قلبی سکون؟

اے اللہ! ہمیں ایسی نیکیاں کرنے کی توفیق عطا فرما جو ہمارے گناہوں کو دھو دیں اور ایسی توبہ کرنے کی توفیق عطا فرما جس کے انوار سے گناہوں اور نافرمانیوں کے اندھیرے چھٹ جائیں۔ (جاری ہے)

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر
’’بیان القرآن‘‘ کے ترجمہ وترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں‘
آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو!

محمد عمران ریاض☆

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ نے اپنی معرکۃ الآراء تصنیف ’’اسلام کی نشاۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام‘‘ کی شرح کرتے ہوئے آغاز ہی میں اداروں کی مقصدیت کے ضمن میں ایک بہت اہم نکتے کی جانب اہل علم و دانش کی توجہ مبذول کرائی ہے‘ جس کا مفہوم کچھ یوں بنتا ہے کہ ’’جو ادارے کسی خاص مقصد کے تحت وجود میں آتے ہیں‘ اگر ان کے سامنے اس ادارے کے مقاصد کو وقتاً فوقتاً دہرایا نہ جائے‘ تو پھر ہوتا یوں ہے کہ معاشرے کا جبر اُن پر غالب آتا چلا جاتا ہے اور ان مقصدی اداروں کی حیثیت بھی اُن اداروں کی سی ہوتی چلی جاتی ہے جو کہ بالعموم معاشرے میں موجود ہوتے ہیں‘‘۔ یعنی بالفاظ دیگر‘ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مقصدی ادارے اپنی مقصدیت کھو کر بذاتِ خود ایک مقصد بن جاتے ہیں۔

تنظیم اسلامی بلاشک وشبہ ایک خاص مقصد کے تحت وجود میں آئی ہے۔ وہ مقصد اس تحریک کی تحاریر اور تقاریر سے بالکل بیّن‘ واضح اور مبرہن ہے‘ یعنی ’’اس دھرتی پر اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے نظام کو عہد حاضر کے جدید تقاضوں کے مطابق نافذ کرنا‘‘۔ الحمد للہ تنظیم اسلامی پچھلے اکتالیس برس سے اس عظیم جدوجہد میں مسلسل سرگرم عمل ہے۔ یہ تحریک بیک جنبشِ قلم وجود میں نہیں آئی‘ بلکہ اپنی ایک تاریخ رکھتی ہے۔ یہ تحریک پچھلی بہت سی تحریکوں کا تسلسل ہے۔ اس تنظیم کے قیام اور فکر میں کون کون سے عوامل کارفرما رہے ہیں؟ یا بالفاظِ دیگر اس تنظیم کا یا بانیٔ تنظیمؒ کا فکر کیا تھا؟ یہ جاننا بہت ضروری ہے۔

آغاز میں تو یہ تحریک ایک شخصیت کی پکار ’’مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ؟‘‘ کی بنیاد پر وجود میں آئی۔ بعدازاں ’’قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ‘‘ کے مصداق ’’راہرو ملتے گئے اور کارواں بنتا گیا!‘‘

☆ای میل: imran.riaz92@gmail.com

ہمارے وہ اکابرینِ تنظیم جو آغاز ہی میں ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے ساتھ اس قافلے میں شامل ہو گئے تھے‘ وہ تو اس فکر سے واقف ہیں۔ لیکن مجھ جیسے کئی ساتھی جو بعد میں تنظیم اسلامی کا حصہ بنے ہیں‘ خصوصاً پچھلی ایک دہائی کے دوران‘ ان کی توجہ صحیح معنوں میں مختلف وجوہات کی بنا پر اس فکر کی جانب نہیں ہو رہی جو کہ مطلوب ہے۔ وہ ساتھی‘ ہمارے دیگر مقررین کے دروس و خطابات سن کر تنظیم میں شامل تو ہو جاتے ہیں لیکن ان کی استقامت دیرپا ثابت نہیں ہو پاتی۔ اس کی بنیادی وجہ فکر سے صحیح معنوں میں ناواقفیت اور عدم توجہ ہے‘ فکر کے اجزاء اور تشکیلی مراحل کو نہ سمجھنا ہے۔ مجھ جیسے ایسے کئی نوجوانوں کی خاص تربیت کی ضرورت ہے تاکہ ان کے اندر اسلام کے انقلابی فکر کو اتارا جا سکے‘ کیوں کہ مستقبل کے معمار یہی نوجوان ہیں۔

ہمارے سامنے ایسی کئی تحریکوں کی مثالیں موجود ہیں جو کسی خاص مقصد کے تحت وجود میں آئی تھیں‘ لیکن اس وقت ان کی کیفیت کچھ یوں نظر آتی ہے کہ ؎

کون سی وادی میں ہے‘ کون سی منزل میں ہے
عشقِ بلاخیز کا قافلۂ سخت جاں!

اس کی وجہ صاف ظاہر و باہر ہے کہ ان جماعتوں یا تحریکوں نے اپنے فکر اور اپنے مقصد کو مستحضر نہیں رکھا بلکہ بھلا دیا‘ جس کے تحت وہ جماعتیں اور تحریکیں وجود میں آئی تھیں۔ اپنے کارکنان کی تربیت ان خطوط پر نہیں کی جو کہ اس تحریک یا تنظیم کو مطلوب تھے۔ جماعتی فکر سے مکمل آگاہی بہت بنیادی مسئلہ ہے‘ اگر اسے بروقت واضح اور حل نہ کیا جائے تو پھر کم و بیش تمام مسائل یہیں سے جنم لیتے ہیں۔ فکر سے ناواقفیت کی ایک بہت بڑی وجہ آج کے انسان کی مصروف زندگی ہے۔ سائنسی ترقی کے نتیجے میں انسان اپنی اصل سے دور ہوتا چلا جا رہا ہے اور اسے دنیا ہی میں جنت بنانے کی ترغیب دیتے ہوئے وسائل بھی فراہم کیے جا رہے ہیں۔ اب مسئلہ صرف یہ ہے کہ ان وسائل کو حاصل کرنے کے لیے دن رات ایک کرنا پڑتا ہے اور نتیجہ کچھ یوں نکلتا ہے کہ ؎

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دل فریب ہیں غم روزگار کے!

بہرکیف اپنی اصل سے چمٹے رہنا ہی اصل حقیقت ہے۔ قرآن مجید نے کلمہ طیبہ کو شجرۂ طیبہ سے تشبیہ دی ہے‘ اور فرمایا کہ ’’اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ‘‘ یعنی شجرۂ طیبہ کی بنیاد بھی بہت مستحکم ہوتی ہے اور اس کی شاخیں بھی آسمان کو چھو رہی ہوتی ہیں۔ تنظیم اسلامی کے ہر رفیق کو شجرۂ طیبہ کی مانند ہونا پڑے گا۔ ان کی بنیاد گہری ہونی چاہیے‘ فکر ان کے پورے وجود

میں سرایت کر چکا ہو۔ اور چونکہ تنظیم اسلامی دعوت رجوع الی القرآن کی بنیاد پر قائم ہوئی ہے اس لیے ہمارے نزدیک فکرِ تنظیم کا منبع و سرچشمہ قرآن مجید ہی ہے۔ چنانچہ کتابُ اللہ سے تعلق گہرا ہونا چاہیے۔ اور تعلق کی یہ گہرائی تبھی ممکن ہے جب عربی زبان سے اچھی واقفیت ہوگی۔ پھر تو انسان کے وجود سے عبدیت کے مظاہر بھی پھوٹیں گے۔ بقول علامہ اقبال ؎

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شدٗ جہاں دیگر شود

گویا قرآن انسان کا حال بن جائے‘ محض قال تک محدود نہ ہو۔ قرآن ہی سے حقیقی و شعوری ایمان بھی پیدا ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ سنت و حدیث کا مطالعہ بھی لازم ٹھہرے گا‘ تاکہ سیرتِ طیبہ کی روشنی میں اپنی تربیت کا عملی طریقہ کار ہر دم پیش نظر رہے۔

ذیل میں چند چیزوں کی جانب اشارہ کرنا پیش نظر ہے‘ یہ چیزیں اگر وقتاً فوقتاً زیر مطالعہ و سماعت رہیں گی تو وہ مقصد بھی سامنے رہے گا جس کے لیے یہ جماعت وجود میں آئی ہے‘ لیکن بدقسمتی سے ہمارے اکثر نئے اور بعض پرانے ساتھیوں کی بھی فکر کی گہرائی سے آگہی تو کجا‘ اس کی چیدہ چیدہ باتوں سے بھی ناواقفیت دیکھنے میں سامنے آتی ہے۔

بانی محترمؒ اپنی فکر کے ضمن میں یہ فرماتے رہے ہیں کہ ان کی فکر یا سوچ کو بننے میں آٹھ محترم شخصیات کو دخل حاصل ہے۔ ان شخصیات کو وہ اپنے ’’علم کے سوتے‘‘ کہتے تھے‘ جن میں سے دو ’’اَبَوَین‘‘ ہیں‘ یعنی مولانا ابوالکلام آزادؒ اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ‘ ان دونوں سے دین کے حرکی تصور کا تعارف حاصل ہوا۔ دو ’’شیخین‘‘ ہیں‘ یعنی شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ ۔ تفسیر عثمانی کے ذریعے ڈاکٹر صاحبؒ اَسلاف کے ’’لنگر‘‘ سے چمٹے رہے اور اس کو آپؒ نے ’’العُروۃ الوُثقٰی‘‘ کہا ہے۔ دو شخصیات ایسی ہیں جن سے ڈاکٹر صاحب پر نظم قرآن اور تدبر قرآن کی بہت سی جہتیں کھلی ہیں‘ یعنی مولانا حمید الدین فراہیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحیؒ۔ اور دو ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے ’’دُکترین‘‘ ہیں‘ جن کے ذریعے اسلام کا ’’انقلابی فکر‘‘ آپ پر واضح ہوا‘ یعنی ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ اور ڈاکٹر محمد رفیع الدینؒ۔ اس کے علاوہ بھی کئی شخصیات سے ڈاکٹر صاحبؒ نے استفادہ کیا ہے‘ لیکن بنیادی یہی ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے‘ ہماری اٹھان ’’تحریک رجوع الی القرآن‘‘ ہے۔ اس ضمن میں بانی تنظیم کی کتاب ’’دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر‘‘ لائق مطالعہ ہے۔ اس معرکۃ

الآراء کتاب میں وہ ساری باتیں بیان ہوئی ہیں جو انجمن خدام القرآن اور تنظیم اسلامی کے قیام کے پیچھے کارفرما رہی ہیں۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ اسلام کے قرنِ اوّل کی صورتحال قرآن مجید کے ضمن میں کیا تھی اور یہ کہ جس خطے میں آج ہم موجود ہیں یہاں قرآن مجید کی خدمت میں کن کن عظیم شخصیات کی صلاحیتیں کارفرما ہیں۔ پھر یہ کہ تنظیم اسلامی کا قیام اپنا ایک تسلسل رکھتا ہے۔ اس کی ایک عظیم تاریخ ہے‘ جس کا یہ تسلسل ہے۔ یہ تفصیل ’’تنظیم اسلامی کا تاریخی پس منظر‘‘ میں ملے گی۔ اس تنظیم کے بنانے میں کن اشخاص کی مساعی شامل ہے اور یہ کہ اس تنظیم کی ’’قرار دادِ تاسیس‘‘ کیا ہے؟ اس کا بنیادی منشور کیا ہے‘ اس کے بنیادی عقائد کیا ہیں؟ اس اجمال کی تفصیل ’’تعارفِ تنظیم اسلامی‘‘ میں موجود ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ سے بانی تنظیم کی نسبت کیا تھی؟ تحریک دیوبند کیا تھی؟ کون کون سی اہم شخصیات دیوبند سے وابستہ رہیں؟ اس کی تفصیل ’’جماعت شیخ الہندؒ اور تنظیم اسلامی‘‘ میں ملے گی۔ تحریک دیوبند اور تحریک علی گڑھ ہندوستان بلکہ پورے عالمِ اسلام کا ایک اہم جزو اور تاریخی ورثہ ہے۔ ان دونوں تحریکوں کا موازنہ اور ان دونوں کے درمیان کی شخصیات کا تعارف ’’اسلام اور پاکستان‘‘ نامی کتابچہ پیش کرتا ہے۔

اس وقت دنیا میں کن افکار و نظریات کا ڈنکا بج رہا ہے‘ کون سی تہذیب پوری دنیا پر چھائی ہوئی ہے‘ اس کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟ اس کے خلاف کون لوگ یا تحریکیں کھڑی ہوئیں ہیں؟ پھر وہ ناکام کیوں ہوئی ہیں؟ اور اب اس عالمی تہذیب سے نکلنے کا ذریعہ یا طریقہ کیا ہے؟ اس اجمال کی تفصیل ’’اسلام کی نشاۃ ثانیہ‘ کرنے کا اصل کام‘‘ جیسی شاہکار اور معرکۃ الآراء تحریر ہمارے سامنے واضح کرتی ہے۔ پھر جب قرآن مجید کی طرف نظر دوڑائی جائے تو قرآن ہم سے پہلے گزری ہوئی امتِ مسلمہ بنی اسرائیل کا تفصیل سے ذکر کرتا ہے۔ چنانچہ سابقہ اور موجودہ مسلمان امتوں کا موازنہ کرنا بہت ضروری ہے تاکہ ان کے آئینہ میں ہم اپنی تصویر دیکھ سکیں۔ ؎

خوشتر آں باشد کہ سِرِّ دلبراں گفتہ آید در حدیثِ دیگراں!

معلوم ہوا کہ اپنا حال بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ اس کی تفصیل ’’سابقہ اور موجودہ مسلمان امتوں کا ماضی‘ حال اور مستقبل‘‘ میں ملے گی۔ اللہ تعالیٰ نے نبی آخر الزماں ﷺ کو دنیا میں بھیجا تو اس کا مقصد کیا تھا؟ اس کے لیے ’’نبی اکرم ﷺ کا مقصد بعثت‘‘ کا مطالعہ مفید مطلب ہے۔

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ پاکستان کی اساس میں جو دو قومی نظریہ کارفرما ہے‘ اس کی بنیاد

اسلام ہے۔ اس سے تو صرف انتہائی درجے کا ڈھیٹ شخص ہی انحراف کرسکتا ہے۔ ''کوا سفید ہے'' جیسی ہٹ دھرمی کا دنیا میں کوئی جواب موجود نہیں۔ پاکستان کی اصل اساس کا اسلام پر ہونا اور اس مملکت خداداد پاکستان کا بچاؤ دین حق کے نفاذ کے ذریعے ہونا' ان جیسے بیشتر سوالوں کے جواب ''استحکامِ پاکستان'' نامی کتاب میں ملیں گے۔ یہ کتاب یقیناً ایک قومی اور ملی ورثہ ہے۔

ہم دنیا میں دین اسلام کا غلبہ چاہتے ہیں' کیا یہ کوئی اضافی ذمہ داری ہے؟ کوئی شوق ہے؟ کوئی جذبہ ہے؟ یا یہ ہمارے دینی فرائض میں سے ہے؟ ان سوالوں کے جواب بانی تنظیم ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے وہ مختصر کتابچے یا لیکچرز دیتے ہیں جو ''فرائض دینی کا جامع تصور' حب رسول اور اس کے تقاضے اور نبی اکرمﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں'' وغیرہ کے عنوان سے موجود ہیں۔ اس قسم کی گفتگو مختلف عنوانات کے تحت آپؒ کے دیگر کتابچوں اور لیکچرز میں موجود ہے۔

''دین اسلام کا غلبہ'' یہ ایک انقلابی فکر کا مختصر عنوان ہے۔ یہ انقلابی فکر ہے کیا؟ برعظیم پاک و ہند میں کن کن لوگوں نے اسے پیش کیا ہے؟ یا یہ کہ اسے بنانے میں کن لوگوں نے اپنا کردار ادا کیا ہے؟ اس کی تفصیل ''برعظیم پاک و ہند میں اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید وتعمیل اور اس سے انحراف کی راہیں'' نامی عظیم کتاب میں ملے گی۔ جب دنیا میں اسلامی انقلاب آجائے گا' ان شاء اللہ' تو اس کے بعد اسلامی ریاست کا سیاسی' معاشرتی اور معاشی نظام (Plitico-Socio-Economic system) کیا ہوگا؟ یہ بحث ''خلافت کی حقیقت اور عصرِ حاضر میں اس کا نظام'' میں کی گئی ہے۔

پھر یہ کہ عہدِ حاضر میں ایک اسلامی انقلابی جماعت کو بذریعہ قرآن کن کن محاذوں پر کام کرنا ہے' اسے بھی محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ ''جہاد بالقرآن اور اس کے پانچ محاذ'' نامی کتاب میں بیان کیا ہے۔ مزید یہ کہ جہاد کی اصل حقیقت کے حوالے سے موصوف کا کتابچہ ''جہاد فی سبیل اللہ: اصل حقیقت' مراحل و مدارج'' کے عنوان سے موجود ہے۔ اسی طرح ''احسان'' (تصوف) ہمارے دین کی اہم اصطلاح ہے' اس کی حقیقت کیا ہے؟ اس بات کو بھی آپؒ نے علمی طور پر ''مروّجہ تصوف یا سلوکِ محمدیﷺ؟ یعنی احسانِ اسلام'' میں بڑی عمدگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

یہ اپنی جگہ ایک مستقل موضوع ہے کہ عہد حاضر میں دین کے قیام کا طریقہ کار کیا ہوگا؟ وہ کون سے سنگ ہائے میل اور نقوشِ پا ہیں جہاں سے کسی بھی انقلابی جماعت کو گزرنا ناگزیر ہے۔ اسے آپؒ کی معرکۃ الآراء اور ضخیم کتاب ''منہجِ انقلابِ نبویﷺ'' بیان کرتی ہے۔ اس

''منہج'' کا خلاصہ ''رسولِ انقلاب ﷺ کا طریق انقلاب'' نامی کتابچے میں موجود ہے۔

اسی عنوان سے یہ بات بھی واضح ہوتی نظر آتی ہے کہ آپؒ جماعت اسلامی سے کیوں اور کیونکر علیحدہ ہوئے تھے؟ وجوہات کیا تھیں؟ جماعت اسلامی نے کس جگہ اسلامی انقلاب کے طریقہ کار میں غلطی کی ہے؟ ان سوالات کے جوابات ''تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ'' اور ''تاریخ جماعت اسلامی کا ایک گمشدہ باب'' جیسی کتابوں میں ملیں گے۔

ایک اسلامی انقلابی جماعت کیسی ہونی چاہیے؟ اس میں ذمہ داریوں کا تعین کیسے ہو؟ اس کا ضابطۂ اخلاق (Code of ethics) کیا ہو؟ وغیرہ' یہ باتیں ''حزب اللہ کے اوصاف اور امیر و مامورین کا باہمی تعلق'' میں موجود ہیں۔

اسی طرح اپنے دور کو پہچاننا کہ ہم کس دور میں جی رہے ہیں؟ آیا دین کا غلبہ ہے یا نہیں؟ اللہ کی شریعت کہیں نافذ ہے یا نہیں؟ یہ دیکھنا کہ ہمارا یہ دور محض چند عبادات کے ساتھ ساتھ نوافل ادا کرنے کا ہے یا ع ''ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں!'' کے مصداق یہ دور کچھ اور تقاضے بھی رکھتا ہے۔ اس کی تفصیل ''قربِ الٰہی کے دو مراتب'' نامی کتاب میں ملے گی۔

اس کے علاوہ بانی تنظیم ڈاکٹر اسرار احمدؒ کا شہرۂ آفاق بیان القرآن' تفصیلی منتخب نصاب' ابوظہبی سیریز کے لیکچرز' خطباتِ ہند اور حقیقتِ ایمان کے عنوان سے لیکچرز...... یہ وہ عظیم سرمایہ ہیں جو آنے والے کئی ادوار تک امت کی راہنمائی کرتے رہیں گے۔ نیز یہ کہ شرک' توحید اور اطاعت کے عنوان پر بھی آپؒ کی تصانیف اور لیکچرز موجود ہیں۔ استاد محترم بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ سے براہ راست استفادے کی یہی صورت ممکن ہے کہ جو علمی وراثت وہ چھوڑ کر گئے ہیں اسے مضبوطی سے تھام کر اس پر عمل پیرا ہوا جائے۔ اگر ہم اللہ عزوجل کی رضا اور نجاتِ اخروی کے طلبگار ہیں' اور اس دنیا میں دین اسلام کو قائم اور غالب کرنا چاہتے ہیں تو پھر ہمیں اپنی ''اصل'' کی طرف لوٹنا ہوگا۔ قرآن مجید کو اپنی زندگی کا مرکز و محور اور سیرت النبیﷺ کو مثال بنانا ہوگا۔ اسی میں فرد کی بھی نجات مضمر ہے اور جماعت کی بھی۔ اسی اصل کو سطورِ بالا میں ٹوٹے پھوٹے الفاظ کے ذریعے بیان کرنے کی حقیری سی کوشش کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں سمجھنے کی اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو!

❁❁❁

وجودِ مادّی سے معرفتِ الٰہیہ تک

راحیل گوہر☆

انسانی زندگی اپنی موجودہ شکل میں نامکمل اور تشنہ ہے۔ مادی دنیا کے حصار میں مقید یہ زندگی نامرادیوں‘ محرومیوں اور ناپائیداریوں کی زد میں ہے‘ اور محض اپنے وجود میں سمٹی ہونے کے باعث یہ قطعی بے مقصد اور بے معنی ہے۔ انسان کا یہ مادی وجود غیر تشفی بخش صورتِ حال میں غیر شعوری طور پر ہمیشہ اس حیثیت کے لیے آرزومند رہتا ہے جو مکمل ہو‘ بے عیب اور لازوال ہو۔ مادی جسم کے ساتھ بھٹکتی روح ہمیشہ اپنے اصل مسکن اور مرکز تک پہنچنے کے لیے مضطرب و بے قرار رہتی ہے۔

انسان کی یہ بنیادی آرزو دنیا میں مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ وہ تمام آرزوئیں‘ خواہشات‘ نصب العین‘ مقاصد اور امیدیں جو انسان اپنی اس حیاتِ دنیوی میں مختلف اشیاء سے وابستہ کر لیتا ہے‘ وہ دراصل اسی مکمل اور بے عیب ذات کی طلب ہے جو انسانی روح کا اصل منبع ومحور ہے۔ چنانچہ انسان اپنے وجود کے اس خلا کو پُر کرنے کے لیے اپنے فکر ونظر میں سینکڑوں بُت تراش لیتا ہے‘ اور لاعلمی اور لاشعوری طور پر ان بُتانِ آزری سے تسکینِ قلب حاصل کرتا ہے‘ لیکن روح کی تشنگی پھر بھی نہیں جاتی۔ وطن پرستی‘ نسل پرستی‘ علاقائیت اور انانیت‘ یہ سب انہی معبودانِ باطل کے رنگ ہیں۔ یہ دنیا کی اکثریت کا خود ساختہ فکری محور ہے جس کے گرد انسان برسہا برس سے طوافِ آرزو کر رہا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد اپنی تصنیف ’’فلسفہ‘‘ میں لکھتے ہیں:

’’خدا کی ہستی کا اعتقاد انسانی فطرت کے اندرونی تقاضوں کا جواب ہے۔ اسے حیوانی سطح سے بلند ہونے اور انسانیت اعلیٰ کے درجے تک پہنچنے کے لیے بلندی کے ایک نصب العین کی ضرورت ہے اور اس نصب العین کی طلب بغیر کسی ایسے تصور کے پوری نہیں ہو سکتی جو کسی نہ کسی شکل میں اس کے سامنے آئے‘ لیکن مشکل یہ ہے کہ مطلق کا

☆ای میل: raheelgoher5@gmail.com

تصور سامنے آ نہیں سکتا۔ وہ جبھی آئے گا کہ ایجابی صفتوں کے تشخص کا کوئی نہ کوئی نقاب چہرے پر ڈال لے۔ چنانچہ ہمیشہ اس نقاب ہی کے ذریعے جمالِ حقیقت کو دیکھنا پڑا۔ یہ کبھی بھاری ہوا‘ کبھی ہلکا‘ کبھی پُرخوف رہا‘ کبھی دل آویز‘ مگر اترا کبھی نہیں۔ انسان کو قلیل علم دیا گیا ہے‘ بس اتنا ہی کہ اس عارضی وفانی دنیا میں وہ ایک بہتر زندگی گزار سکے‘ خیر وشر کی تمیز کر سکے۔ یہ دونوں صفات اس کے خالق ومالک نے اس کے جسمانی وجود میں ازخود رکھ دی ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَنَفۡسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۷ فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَتَقۡوٰىهَا ۸﴾ (الشمس) ’’اور نفسِ انسانی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے ہموار کیا‘ پھر اس میں بدی اور اس کی پرہیزگاری اس پر الہام کر دی‘‘۔ اور ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا کہ: ﴿وَهَدَيۡنٰهُ النَّجۡدَيۡنِ ۱۰﴾ (البلد) ’’اور (نیکی اور بدی کے) دونوں نمایاں راستے اسے (نہیں) دکھا دیے؟‘‘

ان سب کے ساتھ انسان کو ارادہ واختیار کی آزادی بھی دے دی‘ اس لیے کہ یہ دنیا ایک امتحان گاہ ہے‘ جس میں ہر متنفس حالتِ امتحان میں رکھا گیا ہے۔ ارادہ واختیار کی آزادی کے بغیر کسی امتحان کا تصور بھی محال ہے۔ ہاتھ پیر باندھ کر کسی سے مقابلہ نہیں کرایا جا سکتا۔ اگر ایسا ہونے لگے تو یہ مقابلہ اور امتحان نہیں‘ ظلم وجبر ہو گا اور یہ فطرت کے اٹل قانون کے صریح خلاف ہے۔

جب انسان عقلِ قلیل کی بنا پر اپنی زندگی کا لائحہ عمل ترتیب دیتا ہے تو اس میں بہت سے جھول اور نقائص پیدا ہو جاتے ہیں‘ کیونکہ الہامی ہدایت اور رہنمائی کے بغیر محض عقل کی بنیاد پر بنائے ہوئے سارے نقشے ریت پر لکھی تحریر ثابت ہوتے ہیں‘ اور ریت تیز وتند ہواؤں کے سامنے بے بس ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ نماز کی ہر رکعت میں اللہ تعالیٰ کے حضور یہ درخواست پیش کی جاتی ہے: ﴿اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ﴾ ’’(بارِالٰہا!) ہمیں ہدایت دے سیدھے راستے کی طرف!‘‘

انگریز مفکر تھامس ہابز (۱۶۲۹_۱۵۸۸ء) کہتا ہے:

’’ہمارا قائم کیا ہوا ہر تصور محدود ہوتا ہے‘ اس لیے لامحدود کا علم نہیں ہو سکتا۔ لامحدود کا لفظ صرف ایک سلبی حد ہے اور یہ لفظ اس کے لیے بولا جاتا ہے جس کی ہم کوئی حد قائم نہ کریں۔ یہ لفظ کسی وجود کی صفت نہیں بلکہ ہمارے عجز کا اظہار ہے۔ کائنات کا بحیثیتِ مجموعی بھی کوئی علم نہیں ہو سکتا‘ اس کے آغاز اور زمانۂ قیام اور حجم کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ علم دینیات کے لیے وقف ہے۔‘‘

اب چونکہ جسم مادی اس دنیا کا اسیر اور حصولِ دولت‘ حشمت و وجاہت کے سبب فریب خوردہ ہے‘ اس لیے اس کے خالق کی طرف سے خصوصی فضل وکرم اور توفیق کی ضرورت ہے‘ تاکہ روح کا یہ جذبہ اور طلب‘ اللہ کی طرف مرکوز ہو جائے۔ جب دنیا کی تمام چیزوں سے ہٹ کر روحِ انسانی کی یہ طلب محض ایک نکتہ یعنی معبودِ حقیقی پر مرکوز ہو جاتی ہے اور روح اپنے اصل مقصود کو پہچان لیتی ہے تو اس کا جذبہ وفاداری‘ درد اور شوق بھی قوی تر ہو جاتا ہے۔

صوفیاء کرام کے نزدیک بھی سلوک اِلی اللہ میں محبت کو مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ قرآن وحدیث میں نہ صرف اللہ تعالیٰ کی بندے کے لیے محبت اور بندے کی اللہ کے لیے محبت کے شواہد موجود ہیں‘ بلکہ مسلمانوں کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت کی تلقین کی گئی ہے اور اسے ایمان کی علامت بتایا گیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ﴾ (البقرۃ: ۱۶۵)

’’اور بعض لوگ ایسے ہیں جو غیر اللہ کو شریک بناتے ہیں اور ان سے اللہ کی سی محبت کرتے ہیں۔ لیکن جو ایمان والے ہیں وہ تو اللہ ہی کو سب سے زیادہ محبوب رکھتے ہیں۔‘‘

اسی بات کو سورۂ آلِ عمران میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۱﴾﴾

’’(اے نبی ﷺ! لوگوں سے) کہہ دو اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو‘ اللہ بھی تمہیں دوست رکھے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا۔ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔‘‘

امام قشیریؒ نے اپنے ’رسالہ قشیریہ‘ میں نقل کیا ہے: ’’انسان کے نفسانی تقاضوں سے ابھرے یہ سب میلانات عارضی طور سے یا کچھ عرصے کے لیے جھوٹی تسلی دے سکتے ہیں یا عمر بھر کا فریب بھی ثابت ہو سکتے ہیں‘‘۔ بقول میرؔ ؎

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے!

حقیقت یہ ہے کہ یہ سب ’’جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے‘‘۔ کیونکہ زندگی کے ان

مشاغل اور خود ساختہ نظریات کی زد میں آ کر اصل روحِ انسانی اپنی گہرائیوں میں مضطرب اور بیمار رہتی ہے۔ مولانا رومؒ اپنے ملفوظات میں لکھتے ہیں:

’’آدمی میں ایک ایسی جان‘ درد‘ کسک اور طلب ہے کہ اگر اس کو لاکھ جہانوں کی حکومت مل جائے‘ تب بھی اس کی تسلی نہیں ہوگی اور اس کو آرام نہیں آئے گا۔ لوگ نہایت محنت سے مختلف پیشوں‘ صنعتوں اور عہدوں کے لیے کوشاں رہتے ہیں‘ علم نجوم اور طب وغیرہ کی تحصیل کرتے ہیں اور ذرا دم نہیں لیتے‘ کیوں کہ جو چیز مقصود ہے وہ نہیں حاصل ہو سکی ہے۔ آخر محبوب کو دل آرام کہا جاتا ہے‘ یعنی دل کو اس سے آرام ملتا ہے‘ تو بھلا پھر کسی غیر سے اس کو کیونکر آرام اور قرار حاصل ہو!‘‘

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ’’جو اللہ تعالیٰ سے ملنے کو محبوب رکھتا ہے‘ اللہ تعالیٰ بھی اس سے ملنا پسند کرتے ہیں اور جو اللہ تعالیٰ سے ملنا نہیں چاہتا‘ تو اللہ تعالیٰ بھی اس سے ملنا پسند نہیں فرماتے۔‘‘

اسی طرح ایک مشہور حدیث قدسی ہے جس میں ربّ کائنات نے فرمایا:

((وَمَا يَزَالُ عَبْدِيْ يَتَقَرَّبُ اِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰى اُحِبَّهٗ ، فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِيْ يَسْمَعُ بِهٖ وَبَصَرَهُ الَّذِيْ يُبْصِرُ بِهٖ وَيَدَهُ الَّتِيْ يَبْطِشُ بِهَا وَرِجْلَهُ الَّتِيْ يَمْشِيْ بِهَا، وَلَئِنْ سَاَلَنِيْ لَاُعْطِيَنَّهٗ وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِيْ لَاُعِيْذَنَّهٗ)) (۱)

’’جب میرا کوئی بندہ نوافل کے ذریعے سے میرا تقرب چاہتا ہے تو میں بھی اس کو محبوب رکھتا ہوں‘ پھر جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے‘ اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے‘ اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے‘ اور اُس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔ اور اگر وہ مجھ سے مانگتا ہے تو میں لازماً دیتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے کوئی پناہ چاہتا ہے تو اسے پناہ بھی لازماً دیتا ہوں۔‘‘

اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اُس کی بندگی کے لیے ضروری ہے کہ انسان کو اللہ کے مقام و مرتبہ کا صحیح علم حاصل ہو۔ اللہ کے بارے میں ناقص علم بسا اوقات انسان کو گمراہی کے راستے پر بھی ڈال دیتا ہے‘ یہ کوتاہ علمی کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ﴾ (البقرۃ: ۲۶)

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الرقاق‘ باب التواضع۔

''اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے سے بہتوں کو گمراہی میں مبتلا کر دیتا ہے اور اسی کے ذریعے سے بہتوں کو راہِ راست دکھا دیتا ہے۔''

صحیح علم کے بارے میں امام مالکؒ نے فرمایا ہے:

''علم کثرت روایت اور طول وعرض کا نام نہیں بلکہ وہ ایک نور ہے جس کے بعد دماغ رٹنے کا محتاج نہیں رہتا' اس کی روشنی میں حقائقِ اشیاء اسی طرح نظر آنے لگتے ہیں جیسا کہ آفتاب کی روشنی میں سیاہ وسفید۔''

علم درحقیقت اسی نور کا نام ہے۔ جب تک یہ نور پیدا نہ ہو اس وقت تک مسائل غامضہ تو درکنار' بدیہیات بھی اپنی پوری حقیقت کے ساتھ منکشف نہیں ہوتے۔ پھر بھلا اس شکستہ علم کی بنا پر انسان اپنے ربّ کی معرفت کیونکر حاصل کر سکتا ہے۔ سید علی بن عثمان ہجویریؒ 'کشف المحجوب' میں فرماتے ہیں:

''معرفتِ الٰہی کی دو قسمیں ہیں: ایک علمی اور دوسری حالی۔ علمی معرفت یہ ہے کہ خداوندکریم کے بارے میں انسان کا علم صحیح ہو' اس میں کوئی ٹیڑھ اور غلطی نہ رہے۔ حالی معرفت یہ ہے کہ بندے کا حال (اس کی عملی زندگی) اس کی علمی معرفت کا آئینہ دار اور مجسمہ ہو...... حالی معرفت علمی معرفت پر فضیلت رکھتی ہے اور یہی مطلوب و مقصود ہے۔ علم حال کے بغیر ہو سکتا ہے لیکن حال علم کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ عارف جاہل نہیں ہو سکتا اور جاہل عارف نہیں ہو سکتا۔''

حق کا علم ہی اصل علم ہے' اور اس کی روشنی میں جو افکار و نظریات انسان کے قلب پر مرتب ہوں گے' وہی انسان کے اندر وہ تقویٰ پیدا کریں گے جو اس کو معرفتِ ربّ سے قریب تر کرتا جائے گا۔ حق کی پہچان ہی اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے۔ علم کی ابتدا حقائق ہی کے ادراک سے ہوتی ہے' یہی حقائق اور آیات بینات ہیں جن سے ہمیں ربّ کائنات کا سراغ ملتا ہے اور جن کا عمیق مطالعہ معرفتِ الٰہی کے لیے ناگزیر ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ وَالۡفُلۡكِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَبَثَّ فِیۡهَا مِنۡ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۶۴﴾﴾ (البقرة)

''بے شک آسمانوں اور زمین کی ساخت میں' رات اور دن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں' ان کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں' بارش کے اس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے' پھر اس کے ذریعے سے مردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے اور زمین میں ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے' ہواؤں کی گردش' اور ان بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع فرمان بنا رکھے ہیں' عقل مندوں کے لیے بے شمار نشانیاں ہیں۔''

یہ آیاتِ بیّنات فاطر السماوات والارض کے علم وقدرت کے مظاہر ہیں جن کے مطالعہ سے ہمیں معرفتِ الٰہی حاصل ہوتی ہے' کیونکہ ان سب کی گہرائیوں میں اس کی مشیت کارفرما ہے۔ جب تک کسی کو علم حقیقی کا یہ مقام حاصل نہ ہو جائے اس وقت تک معرفت ربّ کا حصول محض جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے کے مترادف ہے۔ اگرچہ مجرد علم وعقل ہی اشیاء کو پہچاننے کے ذرائع ہیں' تاہم معرفت ربّ کے لیے مجرد علم کفایت نہیں کر سکتا' کیونکہ کسبی علم اور عقل معرفت کی علت نہیں ہوتے۔ معرفت کی علت ربِّ کائنات کی خاص عطا اور عنایت ہے جو وہ اپنے چیدہ چیدہ بندوں کو ہی دیا کرتا ہے۔ اور اس علّت معرفت کے ساتھ تقویٰ کو مشروط کیا گیا ہے۔

ارسطو کے نزدیک خدا کا مفہوم یہ ہے کہ 'وہ علّتِ اولیٰ یا محرک اول ہے۔ ہر شے کی کوئی علت ہوتی ہے اور اس علت کی پھر کوئی علت ہے۔ اس طرح علتوں کا یہ سلسلہ چلا جاتا ہے' حتیٰ کہ ایک ایسی علت پر ختم ہو جاتا ہے جس کا کوئی معلول تو ہو سکتا ہے لیکن اس کی علت نہیں ہو سکتی۔ آخری علّت لازمی طور پر ازلی و ابدی ہے' نہ اس کی ابتدا ہے اور نہ انتہا' وہ ہر قسم کی ترکیب وتعدد سے مبرّا ہے اور ہر قسم کے نقص سے پاک ہے۔''

امیر المومنین علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''ہم نے اللہ عزوجل کو اُسی کی عنایت سے پہچانا اور جو کچھ اس کے ماسوا ہے اسے اس کے نور سے پہچانا۔''

عقل واستدلال دلائل کی بنیاد پر اپنے مافی الضمیر کے آئینہ میں تدبّر کرتے ہیں' جبکہ معرفت ربّ تمام دلائل واستدلال اور امثال وتشبیہات سے قطعی ماوراء ہے۔ عبداللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں: ''معرفت یہ ہے کہ تمہیں کسی شے کو بھی دیکھ کر یا جان کر تعجب نہ ہو''۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کی معرفت کے لیے کسی دلیل' سوچ بچار اور استدلال کی کسی پہلو سے بھی گنجائش نہیں ہوتی۔ اسی چیز کو مزید واضح کرتے ہوئے ایک بزرگ ابویزیدؒ فرماتے ہیں:

''معرفت تو یہ ہے کہ تو جان لے کہ مخلوق کی تمام حرکات وسکنات اللہ کی طرف سے ہیں اور کسی شخص کو اس کے اذن کے سوا اس کے مِلک میں کوئی تصرف حاصل نہیں ہے' اور ہر شے میں بھلا اور برا جو اثر ہے اُسی کی طرف سے ہے۔ یہ جان لینے کے بعد انسان میں کامل تفویض الی اللہ کی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔''

اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس پر ایمانِ کامل نہ حسی ہے اور نہ انانیتی' بلکہ یہ انسان کی فطرت میں اخلاقی قانون کی موجودگی کا اظہار ہے۔ اس کا منبع فطرت انسانی کی ایک عمومی اور کلی حقیقت ہے' تاہم شرط یہ ہے کہ انسان کی فطرت مرورِ زمانہ سے مسخ نہ ہوگئی ہو۔

امام غزالیؒ ''احیاء العلوم'' میں لکھتے ہیں:

''دل میں ایک قوت ہے جس کو نورِ الٰہی کہتے ہیں' جس کے باب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''بھلا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا ہے اور وہ اپنے رب کی طرف سے ایک روشنی پر چل رہا ہے (اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جس نے ان باتوں سے کوئی سبق نہ لیا ہو)؟''

اس کیفیت کو عقل' بصیرتِ باطنی' نورِ ایمان اور نورِ یقین بھی کہتے ہیں۔ یہ ایک ایسی صفت ہے جس سے دل ان باتوں کی دریافت کرتا ہے جو متخیل ہیں نہ محسوس۔ آگے فرماتے ہیں کہ:

''موت محلِ معرفتِ الٰہی کو فنا نہیں کرتی اور محلِ معرفت روح ہے جو امرِ ربانی اور آسمانی ہے' موت صرف روح کے حالات اور اس کے کاموں اور عوائق کو تبدیل کرتی ہے اور اس کو حبس سے رہا کر دیتی ہے' نیست ہرگز نہیں کرتی۔''

چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝١٦٩ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِھِمْ مِّنْ خَلْفِھِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْھِمْ وَلَا ھُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝١٧٠ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝١٧١﴾ (آلِ عمران)

''جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے انہیں مردہ نہ سمجھو' وہ تو حقیقت میں زندہ ہیں' اپنے ربّ کے پاس سے رزق پا رہے ہیں۔ جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے اس

پر خوش وخرم ہیں اور مطمئن ہیں کہ جو اہلِ ایمان ان کے پیچھے دنیا میں رہ گئے ہیں اور ابھی وہاں نہیں پہنچے ہیں' ان کے لیے بھی کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔ وہ اللہ کے انعام اور اس کے فضل پر شاداں وفرحاں ہیں اور (ان کو معلوم ہو چکا ہے کہ) اللہ مؤمنوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔''

اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی ذات وصفات کے متعلق ہمیں صوفیائے اسلام کے ہاں بھی اہم خیالات ملتے ہیں۔ صوفیاء ذاتِ الٰہیہ کی معرفت کے لیے مجرد عقل وفکر کی بہ نسبت وجدان اور وارداتِ باطنیہ پر زور دیتے ہیں۔ تاہم ان کے قیاسات منطق اور مجرد فکر سے بھی پورے طور پر خالی نہیں ہوتے۔ صوفیاء کے ہاں وحدۃ الوجود کا نظریہ ملتا ہے جس کی رو سے وجود اور ہستی صرف اللہ کی ہے' باقی سب اس کا ظہور و تمثل ہے' جس کا مطلب یہ ہے کہ موجوداتِ عالم اعیانِ ثابتہ کی حیثیت سے پہلے ہی سے علمِ الٰہی میں موجود تھے۔

معرفتِ الٰہیہ تک پہنچنے کا راز اللہ عزوجل کے کلام میں عمیق تدبر کرنے سے انسان پر کھلتا ہے۔ کلام متکلم کی صفت ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے معنی ومفہوم کا گہرا فہم اور کلامِ الٰہی کی آیات میں استغراق اور غوطہ زنی' غیر محسوس طور پر بندے کو اللہ کے قریب کرنے کا سبب بنتی ہے۔ حدیثِ جبرائیل میں ذاتِ الٰہیہ کے شعوری ادراک کی کیفیت کو واضح کیا گیا ہے:

''تو اللہ کی اس طرح عبادت کر گویا اسے اپنے سامنے دیکھ رہا ہے' اور اگر تو اسے نہیں دیکھ سکتا تو (یہ استحضار رہے کہ) اللہ تو تجھے دیکھ ہی رہا ہے۔'' (مسلم)

چنانچہ یہ مقام ہر شخص کو اپنے ذاتی تجربے اور جذب وآہنگ میں مستغرق ہو کر حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ حق الیقین تک رسائی کا مؤثر ترین راستہ ہے اور معرفتِ الٰہیہ کے لیے تمام پیچیدہ راہوں کو اس طرح کھولتا ہے جیسے علی الصبح مشرق سے ابھرتا سورج ہر سوُ اجالے بکھیر دیتا ہے اور گل رنگ سویرا چہار سو پھیل جاتا ہے۔

خرد سے راہرو روشن بصر ہے
خرد کیا ہے چراغِ رہگذر ہے
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغِ رہگذر کو کیا خبر ہے!

☆......☆......☆

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور تصوّف

مفتی امانت علی قاسمی

تصوّف کی حقیقت اخلاق کی پاکیزگی اور باطن کی اصلاح، اپنا رشتہ اللہ تعالیٰ سے مضبوط کرنا، دنیا سے بے رغبتی، آخرت کی فکر کرنا، اپنی زندگی کو زہد وتقویٰ سے آراستہ کر کے رذائل سے اپنے آپ کو پاک وصاف کرنا، تمام عبادات میں صفاتِ حسن پیدا کرنا اور منکرات سے نفرت پیدا کرنا ہے۔ انہی پاکیزہ صفات سے اپنے آپ کو متصف کرنے کو احادیث میں 'احسان' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ متعارف تصوف اور اس کا نام قرنِ اوّل اور قرنِ ثانی میں نہیں ملتا، حدیث اور آثارِ صحابہؓ میں بھی اس کا ذکر نہیں ہے۔ تصوف کی اصطلاح کب رائج ہوئی اور کس طرح علمِ باطن اور تزکیۂ نفس میں مشغول حضرات کو صوفیہ کہا جانے لگا؟ اس سلسلے میں مشہور صوفی بزرگ ابوالقاسم القشیری اپنی انتہائی مقبول کتاب الرسالۃ القشیریہ میں لکھتے ہیں:

''جان لو! خدا تم پر رحم کرے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد مسلمانوں کے لیے ان کے زمانہ میں کوئی نام بڑی فضیلت والا سوائے صحبتِ رسول ﷺ کے نہیں رکھا گیا، کیوں کہ اس سے بڑھ کر کوئی اور فضیلت نہیں۔ تب ان کو صحابہ رضی اللہ عنہم کہا گیا، اور جب دوسرے زمانے والوں نے ان کو پایا تو جن لوگوں نے صحابہ کی صحبت حاصل کی ان کا نام تابعینؒ رکھا گیا اور ان کے بعد اس سے بڑھ کر کوئی نام نہ تھا۔ پھر ان کے بعد والوں کو تبع تابعینؒ کہا گیا۔ پھر مختلف قسم کے لوگ پیدا ہوئے اور ان کے مراتب میں فرق پڑ گیا۔ تب ان خواص لوگوں کو جنہیں دین کے کام میں زیادہ توجہ تھی زاہد، عابد کہا گیا۔ پھر بدعت ظاہر ہوگئی اور فرقوں کے مدعی پیدا ہوگئے، ہر ایک فریق نے دعویٰ کیا کہ ہم زاہد ہیں۔ تب اہلِ سُنّت کے خاص لوگوں نے، جو خدا کے ساتھ اپنے نفسوں کی رعایت رکھنے والے اور اپنے دلوں کی غفلتوں سے حفاظت کرنے والے تھے، اس نام کو چھوڑ کر اپنا نام اہلِ تصوّف رکھا، اور دوسری صدی ہجری کے ختم ہونے سے پہلے ہی ان بزرگوں کے لیے یہ نام شہرت پا گیا''۔ (روحِ تصوف، اردو ترجمہ الرسالۃ القشیریہ، ص ۲۷)

تصوّف کی اصطلاح کب رائج ہوئی؟

عہدِ صحابہؓ میں تصوف کی روح اور حقیقت، یعنی زہد وتقویٰ، انابت الی اللہ، عاجزی وانکساری وغیرہ روحانی اور باطنی صفات تو پائے جاتے تھے، لیکن اس لفظ کا استعمال عہدِ صحابہؓ تک نہیں تھا۔ حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ نے ابوالحسن بوشنجہؒ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ تصوف موجودہ زمانے میں صرف ایک نام ہے، جس کی کوئی حقیقت نہیں اور گزشتہ زمانے میں ایک حقیقت تھی جس کا کوئی (مخصوص) نام نہ تھا۔ یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور سلف صالحینؒ کے وقت میں لفظ 'صوفی' تو بے شک نہیں تھا، لیکن اس کی حقیقی صفات ان میں سے ہر ایک میں موجود تھیں، اور آج کل یہ نام تو موجود ہے، لیکن اس کے معنی موجود نہیں۔ اُس زمانے میں معاملاتِ تصوف سے آگاہی کے باوجود لوگ اس کے مدعی نہ ہوتے تھے، لیکن اب دعویٰ ہے، مگر معاملاتِ تصوف سے آگاہی مفقود ہے۔ (گنج مطلوب، ترجمہ کشف المحجوب، ص ۴۷)

شیخ ہجویریؒ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں تصوف کی حقیقت موجود تھی، لوگوں میں زہد وتقویٰ، خشوع وخضوع، فکرِ آخرت اور خوفِ خدا جیسی صفات تھیں اور ان صفات کے متصف حضرات عابد اور زاہد کہلاتے تھے، لیکن تصوف کا لفظ اس وقت رائج نہیں ہوا تھا۔ مولانا جامی نے 'نفحات الانس' میں لکھا ہے کہ پہلا شخص جو صوفی کہلایا ابو ہاشم تھا، جن کا انتقال ۱۵۰ھ میں ہوا اور انہی کے رفقاء کے لیے فلسطین کے مقام رملہ میں ایک پہاڑی پر صوفیہ کی پہلی خانقاہ تعمیر ہوئی جو ایک زرتشتی آتش پرست امیر کی فیاضی کا نتیجہ تھی۔ (نفحات الانس، ص ۳۱)

علامہ ابن تیمیہؒ صوفیاء کی وجہ تسمیہ کے سلسلے میں مختلف اقوال کو نقل کرتے ہوئے قولِ فیصل ذکر کرتے ہیں۔ نیز زاہد کو صوفی کب سے کہنا شروع ہوا؟ اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

''زاہد کو صوفی کہنا دوسری صدی کے درمیان سے ہے، اس لیے کہ موٹے موٹے کپڑے زاہدوں میں زیادہ مستعمل ہوتے تھے۔ اور جس نے یہ کہا کہ یہ صُفّہ کی طرف منسوب ہے، جس کی طرف بہت سے صحابہ منسوب ہیں اور ان کو اہلِ صُفّہ کہا جاتا ہے یا یہ صفا یا صفِ اوّل یا صوفہ بن مروان بن اوبن کا طانجہ یا صوفۃ الصفا کی طرف منسوب ہے تو یہ سب اقوال ضعیف ہیں۔'' (جلاء العینین ص ۶۲)

سب سے پہلے صوفی کا لفظ کن کے لیے استعمال ہوا اور تصوف کی تعریف وشرح کس نے کی اور معارفِ تصوف کو کس نے پھیلایا، اس سلسلے میں علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

''سب سے پہلے صوفی کا نام ابو ہاشم الکوفیؒ کو حاصل ہوا' یہ کوفہ میں پیدا ہوئے اور اپنی زیادہ زندگی شام میں گزاری اور ۱۵۰ھ میں وفات ہوئی۔ اور سب سے پہلے تصوف کے نظریات کی تعریف وشرح ذوالنون المصریؒ نے کی' جو امام مالکؒ کے شاگرد ہیں' اور سب سے پہلے جنید بغدادیؒ نے تصوف کو جمع اور نشر کیا۔''

امام صاحبؒ اور تصوف

جیسا کہ ماقبل میں اس کی وضاحت کی گئی کہ تصوف کی حقیقت عہدِ صحابہ میں موجود تھی' لیکن یہ نام نہیں تھا اور پہلی مرتبہ یہ لفظ ۱۵۰ ہجری میں ابو ہاشم کے لیے استعمال کیا گیا' اس لیے امام صاحب کے ساتھ تصوف اور صوفی کا لفظ تلاش کرنا ایک غیر ضروری اور عبث عمل کہلائے گا' البتہ امام صاحب کی زندگی تصوف کی حقیقت سے بھر پور تھی اور تصوف کی اصل' صفتِ احسان امام صاحب کی زندگی میں نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہے۔ مفتی عزیز الرحمٰن بجنوریؒ کے ایک مکتوب کے جواب میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ فرماتے ہیں:

''متعارف سلوک تو صحابہؓ اور تابعینؒ کے دور میں نہ تھا' البتہ اصل ہر چیز کی وہاں ملتی ہے' اس لیے امام صاحب کا سلوک بھی اسی نوع کا تھا جو نوع اس زمانے میں متعارف تھی۔ سلوک کے اہم اجزاء ورع' خشوع' انابت الی اللہ' تجرد عن الخلق' تبتل الی اللہ' کثرتِ عبادت' کثرتِ ریاضت یہ سب اجزاء امام صاحب کے سوانح میں بکثرت ملیں گے۔''

(مکتوب حضرت شیخ الحدیث بحوالہ امام اعظم ابوحنیفہ مصنف مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری' ص ۳۷۶)

حضرت شیخ الحدیث کی تحریر سے سلوک وتصوف کے اہم اجزاء سامنے آ گئے اور یہ کہ امام صاحب کی زندگی میں شریعت وطریقت کے صفات بوجہ اَتم پائے جاتے تھے۔ ذیل میں ہم امام صاحب کے ورع وتقویٰ' خوفِ خدا' کثرتِ عبادت اور کثرتِ ریاضت کا مختصر تذکرہ کرتے ہیں۔

کثرتِ عبادت

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے تذکرے میں ایسے واقعات کثرت سے ملتے ہیں جن میں امام صاحب کی عبادت وریاضت کو بیان کیا گیا ہے۔ بعض واقعات اور معمولات کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے' جو ہم سب کے لیے عبرت ونصیحت ہے۔

(۱) امام صاحبؒ رمضان میں ۶۰ قرآن ختم کیا کرتے تھے' ایک دن میں' ایک رات میں۔ (تاریخ بغداد: ۱۳/۳۵۵)

(۲) امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے امام صاحب کو دیکھا کہ انہوں نے نماز میں صرف اس ایک آیت پر پوری رات گزار دی: ﴿بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ ۝۴۶﴾ (القمر) (تاریخ بغداد: ۱۳/۳۵۶)

(۳) حضرت محاربؒ بن دثار کہتے ہیں: ''میں نے ابوحنیفہؒ سے زیادہ شب بیدار نہیں دیکھا۔''

(۴) ابو عاصم نبیلؒ کہتے ہیں: ''امام صاحب کو قیامِ صلاۃ اور کثرتِ عبادت کی وجہ سے میخ کہا جاتا تھا۔'' (تاریخ بغداد: ۱۳/۳۵۲)

(۵) سفیان بن عیینہؒ کہتے ہیں: ''ایام حج میں مکہ معظمہ میں امام ابوحنیفہؒ سے زیادہ نماز پڑھنے والا نہیں آیا۔''

(۶) اسد بن عمرؒ کہتے ہیں: ''امام صاحبؒ نے چالیس سال تک عشاء کے وضو سے فجر کی نماز ادا کی۔ آپ اکثر ایک ہی رکعت میں قرآن مجید ختم کرتے تھے''۔ ابن مبارکؒ نے بھی اس روایت کی تائید کی ہے۔

(۷) ابوزائدہؒ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے امام صاحبؒ کے ساتھ ان کی مسجد میں عشاء کی نماز پڑھی۔ جب سب لوگ چلے گئے تو میں ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ امام صاحب نماز کی نیت باندھ کر کھڑے ہو گئے' جب آپ اس آیت پر پہنچے: ﴿فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ ۝۲۷﴾ (الطور) تو اسی کی تکرار فرماتے رہے' یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ (تاریخ بغداد: ۱۳/۳۵۵)

(۸) ابو مطیعؒ کہتے ہیں: ''ہم مکہ میں تھے اور جب کبھی رات میں طواف کے لیے جاتے تو ابوحنیفہؒ اور سفیان ثوریؒ کو طواف میں دیکھتے۔'' (تاریخ بغداد: ۱۳/۳۵۲)

زہد وتقویٰ

یحییٰ بن سعید قطانؒ کہتے ہیں: ''ہم ابوحنیفہؒ کی مجلس میں بیٹھتے اور ان سے استفادہ کرتے' اور جب بھی ہم ان کی طرف دیکھتے تو ہم ان کے چہرے سے سمجھ جاتے کہ یہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہیں۔'' (تاریخ بغداد: ۱۳/۳۵۲)

عبداللہ بن مبارکؒ کہتے ہیں: ''میں کوفہ آیا اور کوفہ والوں سے پوچھا کہ سب سے زیادہ ورع وتقویٰ والے کون ہیں؟ تو لوگوں نے کہا ابوحنیفہ''۔ خود ابن مبارک کا بیان ہے کہ ''میں نے ابوحنیفہ سے زیادہ زہد وتقویٰ کسی میں نہیں دیکھا' حالاں کہ ان کو کوڑوں اور مال وزر کے

ذریعہ آزمایا گیا‘‘۔ (تاریخ بغداد: ۱۳/ ۳۵۶، ۳۵۷)

مکی بن ابراہیمؒ کہتے ہیں: ’’میں نے کوفیوں کی مجالست اختیار کی‘ لیکن میں نے ابوحنیفہؒ سے زیادہ متقی کسی کو نہیں دیکھا‘‘۔ (تاریخ بغداد: ۱۳/ ۳۵۶)

حفص بن عبدالرحمٰن کو امام صاحبؒ نے کپڑے کے تھان کا ایک گٹھڑ بھیجا اور فرمایا کہ فلاں تھان میں عیب ہے‘ جب اس کو فروخت کرو تو عیب کو بیان کر دو۔ حفص بن عبدالرحمٰن نے وہ کپڑا فروخت کر دیا اور عیب بیان کرنا بھول گئے۔ جب امام صاحب کو معلوم ہوا تو بہت پریشان ہوئے اور پورے کپڑے کی قیمت کو صدقہ کر دیا۔ (تاریخ بغداد: ۱۳/ ۳۵۶)

بیعت وصحبت

تصوف کے باب میں صحبت کو بڑا دخل ہے‘ اگر یہ حاصل نہ ہو تو شاید کچھ بھی حاصل نہ ہو۔ اسی صحبت کی وجہ سے حضرات صحابہ ﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ کے اعزاز کے مستحق ہوئے اور یہی اعزاز حضرات تابعین کو ملا: ﴿وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ﴾ (التوبۃ: ۱۰۰)۔ اسی صحبت کی بنا پر حضرت ابوبکر صدیق ؓ مقامِ صدیقیت پر فائز ہوئے اور اسی فیضِ صحبت کی وجہ سے حضرت ابوذر ؓ کو مقامِ جذب وفنا حاصل ہوا۔ غرضیکہ صحبت کو تبدیلِ احوال اور تربیتِ اَخلاق میں بڑا دخل ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہ ؒ اسی مبارک زمانہ (خیر القرون) ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور اسی میں پلے بڑھے‘ اسی دور میں وفات پائی‘ اس لیے حضرات صحابہ کی صحبت اور ان کی ملاقات‘ اسی طرح جلیل القدر تابعین کی صحبتیں اور ان کی ملاقات سے آپ کو حظِ وافر ملا تھا۔ انہی قدسی صفات حضرات کی صحبتوں نے امام صاحب کی زندگی کو زہد وتقویٰ اور کثرتِ عبادت وریاضت سے معمور کر دیا تھا۔

امام جعفر صادق کی صحبت میں

حضرت علی بن عثمان ہجویریؒ فرماتے ہیں کہ امام صاحبؒ طریقت میں امام جعفر صادقؒ کے خلیفہ اور مجاز ہیں۔ حضرت امام اعظمؒ نے سلوک وطریقت کے مراحل امام جعفر صادقؒ سے دو سال میں طے کیے‘ پھر آپؒ نے فرمایا: لولا السَّنَتان لهلك النُّعمان (اگر یہ دو سال نہ ہوتے تو نعمان ہلاک ہو جاتا) یعنی اگر میں دو سال تک امام جعفر صادق ؒ کی خدمت میں نہ رہتا تو اصلاحِ باطن سے محروم ہو جاتا۔ ’تحفۂ حنفیہ‘ کے مصنف نے لکھا ہے کہ جب امام

صاحبؒ کے والد ثابتؒ نے اس دارِ فانی سے رحلت فرمائی اُس وقت آپ بہت کم سن تھے‘ آپؒ کی والدہ ماجدہؒ نے امام جعفر صادقؒ سے نکاح کر لیا‘ اس طرح امام صاحب کو جعفر صادقؒ کی نگرانی میں پرورش پانے کا موقع نصیب ہوا اور آپ نے ان سے علوم ظاہری اور باطنی حاصل کیے۔ (تحفۂ حنفیہ‘ ص ۱۷۱)

مفتی ابوالحسن شریف الکوثری نے اپنی کتاب ’امام ابوحنیفہ: شہیدِ اہل بیت‘ میں لکھا ہے کہ مولانا ابوالوفاء افغانیؒ کے ایک شاگرد نے ان سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: ’’حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ طریقت میں امام جعفر صادقؒ کے مجاز وخلیفہ ہیں اور پھر داؤد طائیؒ امام صاحب کے مجاز وخلیفہ ہیں‘‘۔ (امام ابوحنیفہ: شہید اہل بیت‘ ص ۸۶)

شیخ ہجویریؒ نے اگرچہ امام صاحب کو امام جعفر کا خلیفہ ومجاز قرار دیا ہے‘ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ خلافت واجازت کی تصوفانہ اصطلاح بعد کی رائج شدہ ہے‘ امام صاحب کے عہد تک تصوف ایک فن کی حیثیت سے دیگر علوم اسلامی سے علیحدہ نہیں ہوا تھا‘ اس لیے اس کی اصطلاحات بھی بعد کی پیداوار ہیں‘ لہٰذا خلافت واجازت سے نوازنا اس عہد میں نہیں تھا‘ بلکہ شیخ کی صحبت میں رہ کر اصلاحِ باطن کی طرف توجہ دی جاتی تھی۔

تصوف میں امام صاحبؒ کا مقام ومرتبہ

امام اعظم ابوحنیفہ ؒ بلند پایہ محدث بھی تھے اور فقہ کے امام اعظم بھی‘ اسی کے ساتھ آپ طریقت وتصوف کے عظیم مردِ میدان بھی تھے‘ لیکن آپ نے روایتِ حدیث اور سلوک وطریقت کی ظاہری ترویج کے بجائے صرف فقہ کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا۔ آپؒ نے اپنی ساری زندگی اُمتِ مُسلمہ کی بھلائی کی خاطر وقف کر دی اور فقہ حنفی کی صورت میں امت کو اسلامی قانون کا مجموعہ عطا کیا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی ؒ فرماتے ہیں: ’’میں نے عارفِ ربانی شیخ نصر اللہ شیرازیؒ مہاجر مکی کو فرماتے ہوئے سنا کہ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ جو معارف اور حقائق شیخ ابو یزید بسطامیؒ اور حضرت جنید بغدادیؒ کو حاصل تھے وہ امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کو بھی حاصل تھے۔ شریعت اور اس کے احکام کا علم اس کے علاوہ تھا‘‘۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ فقہ کے ائمہ‘ فقہ اور تصوف دونوں کے ساتھ متصف تھے اور دونوں کے جامع تھے‘ اور انصاف یہ ہے کہ ائمہ تصوف بھی دونوں کو جامع تھے‘ فرق غالب اور مغلوب کا تھا (یعنی ائمہ فقہ پر فقہ کا اور ائمہ تصوف پر تصوف کا

غلبہ تھا)۔ (سیدنا امام اعظمؒ، ص ۱۲۵)

مفتی ابوالحسن شریف الکوثریؒ نے لکھا ہے کہ امام مناویؒ سمیت صوفیاء کے کئی سوانح نگار مصنفین نے امام صاحب کو تصوف و سلوک کے بڑے مشائخ میں شمار کیا ہے۔

شریک نخعیؒ کا بیان ہے:

''ابوحنیفہ کی طویل خاموشی، دائمی فکر اور لوگوں سے کم کلام کرنا یہ سب واضح علامت ہے علم باطن اور دین کے اہم امور میں مشغولی کی، اور پھر یہ کہ جس کو خاموشی اور زہد دیا گیا اس کو کُل کا کُل علم دے دیا گیا۔'' (امام اعظم ابوحنیفہ، حالات، کمالات، ملفوظات ص ۹۴)

شیخ علی ہجویریؒ اپنی کتاب 'کَشفُ المَحجُوب' میں لکھتے ہیں:

''اور انہی بزرگوں میں امامِ جہاں، مقتدائے خلق، زینت و شرفِ فقہاء، باعثِ شانِ علماء، حضرت ابوحنیفہ نعمان بن ثابت الخزاز رحمہ اللہ بھی شامل تھے۔ عبادت و مجاہدہ میں انتہائی ثابت قدم تھے اور اس طریقت کے اصولوں میں شانِ عظیم کے مالک تھے۔ ابتدائے حال میں گوشہ نشینی کا ارادہ رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ تمام مخلوق سے کنارہ کش رہیں، یوں کہ گویا ان کے درمیان میں ہیں ہی نہیں، کیونکہ ان کا دل امارت و جاہ و حشم سے پاک ہو چکا تھا اور وہ اپنے آپ کو شائستہ درگاہِ الٰہی بنا چکے تھے۔''

(گنج مطلوب، ترجمہ کشف المحجوب، ص ۱۴۹)

حضرت فریدالدین اولیاءؒ نے 'تذکرۃ الاولیاء' میں امام صاحبؒ کے تصوف میں بلند مقام کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

''عارف، عامل صوفی، فقیہہ، محدث، عالمِ دنیا ابوحنیفہ کوفی رحمہ اللہ کے ریاضات و مجاہدات اور ان کے مشاہدات کی انتہا نہ تھی، شریعت و طریقت میں نظر غائر رکھتے تھے، باطن میں صاحب بصیرت تھے، امام ہمام جعفر صادقؒ کے مرید خاص اور فیض یاب تھے، ابوحنیفہؒ کے مرید فضیل بن عیاض بن ابراہیم، بشر حافی، داؤد طائی جیسے اقطاب تھے۔''

(تذکرۃ الاولیاء، ص ۱۸)

امام صاحب طریقت کے امام اعظم تھے

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ جس طرح حدیث اور فقہ میں امامت کے منصب جلیل پر فائز تھے اسی طرح طریقت و تصوف میں بھی آپ اپنے ہم عصروں میں امام اعظم تھے۔ امام صاحب کے بعض شاگردوں نے طریقت میں خوب شہرت حاصل کی تھی۔ پہلے بھی گزر چکا کہ داؤد طائیؒ نے

شریعت کے ساتھ ساتھ طریقت کا علم بھی امام صاحب سے حاصل کیا تھا اور وہ امام صاحب کے بھی خلیفہ و مجاز تھے۔ علامہ حصکفیؒ نے 'دُرّ مختار' میں لکھا ہے:

''استاذ ابوالقاسم القشیریؒ اپنے رسالہ میں، باوجود اپنے مذہب (شافعی) میں سخت ہونے کے اور طریقت میں پیش پیش ہونے کے، فرماتے ہیں: میں نے استاذ ابوعلی دقاقؒ سے سنا، فرماتے تھے: میں نے طریقت کو حضرت ابوالقاسم نصرباذیؒ سے حاصل کیا اور ابوالقاسم فرماتے تھے کہ میں نے حضرت شبلیؒ سے حاصل کیا اور انہوں نے سری سقطیؒ سے اخذ کیا تھا اور انہوں نے معروف کرخیؒ سے اور انہوں نے حضرت داؤد طائیؒ سے اور انہوں نے علم شریعت اور طریقت دونوں کو امام اعظم ابوحنیفہؒ سے حاصل کیا تھا۔'' (درمختار ۱/۱۲، مکتبہ زکریا)

حضرت شبلیؒ اور ان کے پیر حضرت سری سقطیؒ کی بزرگی اور طریقت کا اعلیٰ ترین درجہ سب کو معلوم ہے، تو جن حضرات سے ان کو یہ درجے حاصل ہوئے خیال کیجیے وہ کیا ہوں گے! علامہ حصکفیؒ لکھتے ہیں کہ امام صاحب علم ظاہر و باطن میں اعظم ترین تھے، بہت سے معروف اولیاء اللہ آپ کے متبع ہوئے ہیں، اگر ان حضرات اولیاء اللہ کو کسی بھی بات میں ذرا سا بھی شبہ پیش آتا تو وہ کبھی بھی ان کا اتباع نہ کرتے، نہ اقتدا کرتے، نہ موافقت کرتے۔

واقعہ یہ ہے کہ آپؒ کے اخلاص، صداقت و دیانت، عبادت و ریاضت اور زہد و تقویٰ کے باعث اللہ تعالیٰ نے آپ کو تصوف و طریقت میں بلند درجہ عطا کیا اور امامت و اجتہاد کے مقام پر فائز فرمایا۔ اس کی تائید حضرت شیخ علی ہجویریؒ کی اس تحریر سے بھی ہوتی ہے کہ انہوں نے خواب میں آقا و مولیٰ ﷺ کی زیارت کی اور دیکھا کہ آپ ﷺ امام اعظم ابوحنیفہ کو اپنی گود میں اٹھائے ہوئے تشریف لا رہے ہیں۔ آپ لکھتے ہیں:

''خواب سے ظاہر ہو گیا کہ امام ابوحنیفہ ان پاک لوگوں میں سے تھے جو اوصافِ طبع میں فانی اور احکام شرع میں باقی ہیں، اس لیے کہ حضور ﷺ آپ کو اٹھا کر لائے، یعنی آپؒ کے چلانے والے سید عالم ﷺ ہیں۔ اگر آپ خود چل کر آتے تو باقی الصفت ہوتے۔ باقی الصفت لوگ منزل کو پا بھی سکتے ہیں اور منزل سے بھٹک بھی سکتے ہیں۔ چوں کہ رسول اللہ ﷺ نے آپ کو اٹھایا ہوا تھا، اس لیے یقیناً آپ کی ذاتی صفات فنا ہو چکی تھیں اور وہ آقاء کریم ﷺ کی صفات کے ساتھ صاحبِ بقا تھے۔''

(کشف المحجوب، ص ۱۶۵)

امام صاحب کے صوفیاء تلامذہ

امام صاحب طریقت وتصوف میں اپنے ہم عصروں پر فوقیت رکھتے تھے۔ فقہ وحدیث کی طرح وہ اس میدان کے بھی شہباز تھے اور اس میں انہوں نے بلندی ورفعت کے آسمان کو چھو لیا تھا۔ اس فن میں امام صاحب کی عظمتِ شان کا اندازہ ان کے تلامذہ سے بھی لگایا جاسکتا ہے جنہوں نے اس میدان میں خوب شہرت حاصل کی ہے۔ امام صاحب کے ان صوفیاء تلامذہ کے مقام ومرتبہ اور لوگوں کے دلوں میں ان کی عظمت ومحبت‘ خدمتِ خلق میں ان کی جانفشانی کو دیکھ کر امام صاحب کی عظمت ورفعت کا اعتراف کیا جاسکتا ہے۔ چند مشہور تلامذہ کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے:

حضرت ابراہیم بن ادھمؒ: آپ بادشاہوں کی اولاد میں سے تھے۔ ایک روز شکار کے لیے نکلے اور ایک لومڑی یا خرگوش کو ہنکایا۔ آپ اس کا پیچھا کر رہے تھے کہ غیب سے آواز آئی: اے ابراہیم! کیا تو اس لیے پیدا کیا گیا ہے؟ چناں چہ آپ اپنی سواری سے اتر پڑے‘ ایک چرواہے کا معمولی جُبّہ پہن لیا اور جنگل کی راہ لی۔ کچھ عرصے بعد مکہ مکرمہ پہنچے‘ وہاں سفیان ثوریؒ اور فُضَیل بن عیاضؒ کی صحبت اختیار کی۔ حضرت خضرؑ کے مرید تھے اور بے شمار مشائخ متقدمین کی صحبت اٹھا چکے تھے۔ امام ابوحنیفہؒ سے ربط خاص تھا‘ انہی سے تحصیل بھی کی تھی۔ حقائق تصوف کے بیان میں ان کے نادر مقولے اور نفیس لطائف خاص مقام رکھتے ہیں۔ حضرت جنید بغدادیؒ کہتے ہیں: علومِ طریقت کی کنجیاں ابراہیم بن ادھمؒ کے پاس ہیں۔ (گنج مطلوب‘ ترجمہ کشف المحجوب‘ ص ۱۶۵)

ابراہیم بن ادھمؒ تقویٰ وپرہیزگاری میں بلند مقام پر فائز تھے۔ ان سے منقول ہے کہ اپنی روزی کو پاکیزہ بنالو‘ پھر کوئی مضائقہ نہیں کہ تم رات کو تہجد نہ پڑھو اور دن میں نفلی روزہ نہ رکھو۔ آپ عام طور پر یہ دعا کرتے تھے: ’’اے اللہ! مجھے اپنی معصیت کی ذلت سے اپنی طاعت کی عزت کی طرف پہنچا دے‘‘۔ ابراہیم بن ادھمؒ سے کہا گیا کہ گوشت مہنگا ہوگیا ہے تو آپ نے فرمایا: اسے سستا کردو۔ یعنی اسے مت خریدو! اور یہ شعر پڑھا:

وإذا غلا شيء عليّ تركتُه   فيكون أرخص ما يكون إذا غلا

’’اور جب کوئی چیز مہنگی ہوتی ہے تو میں اس کو ترک کردیتا ہوں‘ اور اس طرح وہ باوجود مہنگی ہونے کے سب سے سستی ہوجاتی ہے۔‘‘

ابراہیم بن ادھمؒ نے ایک مرتبہ طواف کے دوران ایک شخص سے فرمایا: خوب سمجھ لو تمہیں صالحین کا درجہ نصیب نہیں ہوسکتا جب تک تم چھ گھاٹیاں طے نہ کرلو۔ اوّل یہ کہ اپنے اوپر عیش وعشرت کا دروازہ بند کرلو اور مشقت کا دروازہ کھول لو۔ دوسری یہ کہ عزت کا دروازہ بند کرلو اور ذلت کا دروازہ کھول لو۔ تیسری یہ کہ راحت کا دروازہ بند کرلو اور محنت کا دروازہ کھول لو۔ چوتھی یہ کہ نیند کا دروازہ بند کرلو اور شب بیداری کا دروازہ کھول لو۔ پانچویں یہ کہ غناء کا دروازہ بند کرلو اور فقر کا دروازہ کھول لو۔ چھٹی یہ کہ امیدوں کا دروازہ بند کرلو اور موت کی تیاری کا دروازہ کھول لو۔ (روحِ تصوف‘ ص ۲۸)

داؤد طائیؒ: کبار مشائخ اور اہل تصوف کے سرداروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ امام اعظمؒ کے شاگرد اور ابراہیم بن ادھمؒ اور فضیل بن عیاضؒ کے ہم عصر تھے۔ شریعت وطریقت کا علم امام صاحب سے حاصل کیا تھا‘ جملہ علوم وفنون پر بڑی دسترس رکھتے تھے‘ فقہ میں تو فقہاء کے استاذ اور رہنما تھے۔ گوشہ نشینی اختیار کرلی اور دنیاوی جاہ وحشم سے اعراض کرتے ہوئے طریق زہد وتقویٰ کو اختیار کرلیا تھا۔ معروف کرخی کہتے ہیں: میں نے کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جو داؤد طائی کی طرح دنیا کو بالکل بے وقعت اور بے قیمت تصور کرتا ہو‘ یہاں تک کہ تمام دنیا اور سارے دنیا دار ان کے نزدیک مچھر کے برابر بھی قدر وقیمت نہ رکھتے تھے۔ (گنج مطلوب‘ ص۱۷۳)

محارب بن دثارؒ جو مشہور محدث تھے‘ کہا کرتے تھے: اگر داؤد اگلے زمانہ میں ہوتے تو خدا قرآن مجید میں ان کا قصہ بیان کرتا۔ ۱۶۰ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ (رد المحتار ۱/۱۵۴)

فُضَیل بن عیاضؒ: ان کا شمار طریقت کے مشہور بزرگوں میں ہوتا ہے۔ سمرقند میں پیدا ہوئے اور مکہ میں ۱۸۷ھ میں وفات پائی۔ شریک بن عبداللہ کا قول ہے: ہمیشہ ہر قوم کے لیے ان کے زمانہ میں کوئی حجت ہوا کرتا ہے‘ فضیل بن عیاضؒ اپنے زمانے والوں کے لیے حجت ہیں۔ (تہذیب الکمال: ۲۰۸/۲۳‘ ڈیجیٹل لائبریری)

عبداللہ بن مبارکؒ کا قول ہے کہ حجاز میں فضیل بن عیاضؒ اور ان کے بیٹے علی بن فضیلؒ کے علاوہ کوئی ابدال باقی نہیں رہا۔ (سیر اعلام النبلاء‘ ترجمہ فضیل بن عیاض: ۳۹۵/۷)

اوائل عمر میں ٹھگ پیشہ تھے اور راہ زنی کیا کرتے تھے‘ لیکن اس حالت میں بھی طبیعت نیکی وصلاح کی طرف مائل تھی‘ یہاں تک کہ اگر کسی قافلہ میں کوئی عورت ہوتی تو اس کے قریب

تک نہ جاتے اور اگر کسی کے پاس سرمایہ قلیل ہوتا تو اس سے بھی ہرگز نہ چھینتے تھے' بلکہ ہر شخص کے پاس کچھ نہ کچھ باقی رہنے دیتے۔ ایک مرتبہ ایک سوداگر مرو سے روانہ ہوا تو لوگوں نے اسے کہا کہ حفاظتی دستہ ساتھ لیتے جاؤ' کیوں کہ راستہ میں فضیل موجود ہے۔ اُس نے کہا میں نے سنا ہے وہ ایک خدا ترس انسان ہے' لہٰذا مجھے اس کا خوف نہیں۔ اُس نے ایک قاری کو ہمراہ کرلیا اور اسے اونٹ پر بٹھا دیا' جہاں وہ شب و روز قرآن پڑھتا رہتا تھا' حتیٰ کہ قافلہ اس جگہ پہنچ گیا جہاں فضیل گھات میں بیٹھا تھا۔ عین اس وقت قاری یہ آیت پڑھ رہا تھا:

﴿اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ......﴾ (الحدید: ۱۶)

''کیا ایمان والوں کے لیے وہ وقت قریب نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر کے سامنے جھک جائیں......!''

یہ سنتے ہی فضیل کے دل پر رقت طاری ہوگئی اور اس کارِ مذموم سے توبہ کرلی اور جن لوگوں کا مال لوٹ رکھا تھا انہیں خطوط لکھ لکھ کر مال واپس کر دیا۔ پھر مکہ چلے گئے' کچھ مدت وہاں قیام رہا' بعض اولیاء اللہ سے ملاقات کی۔ پھر وہاں سے کوفہ چلے گئے اور امام اعظم ابوحنیفہؒ سے جا ملے اور ایک عرصہ تک ان کی خدمت میں رہ کر علم شریعت و طریقت حاصل کیا۔ (گنج مطلوب' ص ۱۵۶)

تصوف کے باب میں ان کے اقوال کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان کا قول ہے: ''جو اللہ تعالیٰ سے ڈرے کوئی اس کو نقصان نہیں پہنچا سکتا اور جو غیر اللہ سے ڈرے کوئی اس کو نفع نہیں پہنچا سکتا''۔ (سیر اعلام النبلاء' ترجمہ فضیل بن عیاض ۳۹۵/۷)

بشر حافیؒ: بشر بن الحارث حافی کا شمار انہی بزرگوں میں ہوتا ہے جو مجاہدات میں نرالی شان کے مالک تھے۔ فضیل بن عیاضؒ کی صحبت سے مستفیض تھے۔ تصوف کے متعدد مصنفین نے آپ کو امام ابوحنیفہؒ کے تلامذہ میں شمار کیا ہے۔ آپ کا اصل وطن مرو تھا' لیکن بغداد میں سکونت اختیار کی تھی اور وہیں ۲۲۷ھ میں وفات پائی۔ آپ کی توبہ اور زہد و تقویٰ کا واقعہ یہ ہوا کہ ایک بار راستے میں آپ کو کاغذ کا ایک پرزہ ملا' جس پر ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' لکھا ہوا تھا اور وہ پیروں کے نیچے پڑتا تھا۔ آپ نے اسے اٹھالیا۔ آپ کے پاس ایک درہم تھا' اس سے عطر خریدا اور اس پرزے کو معطر کر کے ایک دیوار کے شگاف میں رکھ دیا۔ اسی رات اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھا' جو اُن سے فرما رہا تھا: اے بشر! تو نے میرے نام کو خوشبودار کیا' مجھے اپنے نام کی قسم! میں بھی دنیا اور آخرت میں تیرے نام کو خوشبودار کروں گا۔ اُسی وقت توبہ کی اور زہد کا

راستہ اختیار کیا۔ ان کے زہد و تقویٰ کے حکایات اور بزرگی کا چرچا لوگوں میں بہت زیادہ تھا۔ شیخ ابوعلی دقاق کا بیان ہے کہ بشر حافی کا کچھ لوگوں کے پاس سے گزر ہوا' آپ کو دیکھ کر وہ کہنے لگے: یہ وہ شخص ہے جو ساری رات عبادت کرتا ہے اور تین تین دن پر افطار کرتا ہے۔ یہ سن کر بشر رو پڑے۔ آپ سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو آپ نے فرمایا: مجھے یاد نہیں ہے کہ میں کبھی بھی پوری رات جاگا ہوں یا کسی دن بھی روزہ رکھا ہو اور رات کو افطار نہ کیا ہو' لیکن بندہ جتنا کرتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے لطف و کرم سے اس سے کہیں زیادہ لوگوں کے دل میں ڈال دیتا ہے۔ (روحِ تصوف' ترجمہ الرسالۃ القشیریۃ' ص ۳۸)

یہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے بعض تلامذہ ہیں' جنہوں نے آپ سے کسبِ فیض کیا' آپ کے دامن تربیت میں رہ کر اصلاحِ ظاہر و باطن میں کمال حاصل کیا۔ یہ حضرات تصوف کے اساطین شمار کیے جاتے ہیں' ان کی باتوں کو اربابِ تصوف کے یہاں کافی استناد حاصل ہے' ان کی زندگی نے نہ جانے کتنے لوگوں کی زندگیوں کے دھارے کو اعمال و اخلاق کی طرف موڑ دیا۔ مشہور ہے کہ پھل کو درخت سے اور خوشبو کو پھول سے پہچانا جاتا ہے۔ ان حضرات کی زندگی اور تصوف کے مقام بلند کو دیکھ کر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مقام و مرتبہ اور تصوف میں ان کی امامت کا کھلے دل سے اعتراف کیا جا سکتا ہے۔ ❁❁❁

بقیہ: بیان القرآن

یعنی وہ شیشے کا چکنا فرش تھا اور ملکہ نے جب اس میں اپنا عکس دیکھا تو اسے پانی سمجھ کر پنڈلیوں سے کپڑا اوپر اٹھالیا کہ شاید آگے جانے کے لیے اس پانی سے ہو کر گزرنا ہے۔ بہرحال حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسے اصل حقیقت سے آگاہ کیا۔ اس سے دراصل اسے احساس دلانا مقصود تھا کہ جو نعمتیں اللہ تعالیٰ نے ہمیں دے رکھی ہیں' وہ تمہارے حاشیہ خیال میں بھی نہیں ہیں۔

﴿قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۴﴾﴾ ''اُس نے کہا: اے میرے پروردگار! یقیناً میں نے اپنی جان پر ظلم کیا اور اب میں نے سلیمانؑ کے ساتھ اللہ کی اطاعت اختیار کی ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔''

حضرت سلیمان علیہ السلام کا واقعہ یہاں پر اختتام پذیر ہوا۔ سورت کا یہ حصہ قصص النبیین کے انداز میں ہے۔ اس کے بعد حضرت صالح اور حضرت لوط علیہما السلام کے واقعات میں انباء الرسل کا انداز پایا جاتا ہے۔ ❁❁❁

نیکی پھیلانا اور برائی مٹانا

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

افراد سے مل کر ایک معاشرہ بنتا ہے۔ معاشرے میں اچھے لوگوں کی اکثریت ہو تو بھی وہاں بے عمل اور ضعیف الایمان لوگ موجود ہوں گے۔ کیونکہ شیطان اپنے مشن میں پوری طرح لگا ہوا ہے۔ وہ تو نیکوکار لوگوں کو بھی نہیں چھوڑتا اور طرح طرح کے سبز باغ دکھا کر لوگوں کو برائیوں پر آمادہ کرتا ہے۔ شیطانی حملوں اور ہتھکنڈوں سے بچنے کے لیے مسلمانوں کو قرآن وسنت کو مضبوطی سے پکڑنے کا حکم ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے کسی مسلمان کو صحیح علم و عمل کی توفیق دی ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ دوسروں کو بھلائی کے کاموں کی ترغیب دے اور برائیوں سے روکنے کی ذمہ داری پوری کرے' کیونکہ مؤمن جو اپنے لیے پسند کرتا ہے وہی دوسروں کے لیے پسند کرتا ہے۔ ہر مؤمن کا فرض ہے کہ وہ خود نیکی اختیار کرے اور برائیوں سے دور رہے' پھر دوسروں کو بھی بھلائی کی دعوت دے اور برائیوں سے ٹوکے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (آلِ عمران: ۱۱۰) ''تم بہترین اُمت ہو جسے لوگوں کے لیے برپا کیا گیا ہے تاکہ تم بھلائی کا حکم دو اور برائی سے روکو''۔ اسے ہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کہتے ہیں۔ اور یہ کام رسول اللہ ﷺ کی پوری زندگی پر محیط ہے۔ یہ کام کرنے والوں کو آپؐ نے بڑے اجر کی نوید سنائی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''جس شخص نے کسی نیک کام کی طرف راہنمائی کی تو اس کو اس نیک کام کرنے والے کے اجر کے برابر اجر ملے گا''۔ (صحیح مسلم)

اس امر کو انجام دینے کا راستہ اجر وثواب کے اعتبار سے اعلیٰ درجے کی آسان نیکی ہے' کیونکہ یہ کام انبیاء کرام علیہم السلام کا پوری زندگی کا کام رہا ہے۔ شرط یہ ہے کہ یہ کام محض اللہ کی خوشنودی اور مسلمان بھائی کی خیر خواہی کے لیے ہو۔ ایک شخص شراب اور سود کا عادی ہے۔ کسی نیک آدمی کی پرخلوص تنبیہ سے وہ یہ برائیاں چھوڑ دیتا ہے اور گناہوں سے بچ جاتا ہے تو یہ تنبیہ کرنے والا بھی بڑا اجر پائے گا۔ اسی طرح جو شخص مسلمان ہو کر نماز کی ادائیگی سے غافل

ہے تو جو کوئی نصیحت کر کے اسے نماز کا پابند بنا دیتا ہے تو یہ داعی بھی بڑا ثواب پائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یہ بات کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھ پر اور تمہارے ذریعے کسی ایک آدمی کو ہدایت دے دے تمہارے لیے اس ساری کائنات سے بہتر ہے جس پر آفتاب طلوع ہوتا ہے''۔ (معجم کبیر للطبرانی) یہ اتنا بڑا کارِ ثواب ہے کہ اس کو آمادگی کے ساتھ انجام دینا چاہیے اور جو شخص اس کام سے غافل ہے یہ اس کی بدنصیبی ہے۔ گویا اس کے سامنے صاف پانی کی نہر جاری ہے اور اسے نہا دھو کر صاف ستھرا رہنے کی توفیق نہیں۔

بھلائی کی دعوت دینا اور برائی سے روکنے کے عمل کی فضیلت بیان کرتے ہوئے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''جس بندے نے کسی نیکی کے راستے کی طرف (لوگوں کو) دعوت دی تو اس داعی کو ان سب لوگوں کے اجروں کے برابر اجر ملے گا جو اس کی بات مان کر نیکی کے رستہ پر چلیں گے اور عمل کریں گے اور اس کی وجہ سے عمل کرنے والوں کے اجروں میں کوئی کمی نہ ہو گی۔ (اور اسی طرح) جس نے گمراہی (بدعت وغیرہ) کی طرف دعوت دی تو اس داعی کو ان سب لوگوں کے گناہوں کے برابر گناہ ہو گا جو اس کی دعوت پر اس گمراہی اور بدعملی کے مرتکب ہوں گے اور اس کی وجہ سے ان لوگوں کے گناہوں میں (اور ان کے عذاب میں) کوئی کمی نہ ہو گی''۔ (صحیح مسلم' عن ابی ہریرہؓ)

معلوم ہوا کہ بھلائی کی طرف بلانا جس قدر فضیلت کا کام ہے دوسروں کو بری عادتوں کا رسیا بنا دینا بڑی تباہی اور ہلاکت کا باعث ہے۔ سگریٹ پینے والے' رشوت لینے والے اور سود کھانے والے کی حوصلہ افزائی کرنا نری تباہی ہے۔ گویا جس طرح نیکی کی طرف بلانا فضیلت کا عمل ہے اسی طرح کسی برائی کو عام کرنا دنیا اور آخرت کی رسوائی کا باعث ہے۔

بھلائی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا صرف ایک نیک عمل ہی نہیں بلکہ ہر مسلمان کا فریضہ ہے' کیونکہ یہ اُمت مسلمہ کا بنیادی مقصد ہے۔ قرآن مجید میں حضور ﷺ کی امت سے فرمایا گیا ہے: ''تم وہ بہترین اُمت ہو جو لوگوں (کی اصلاح وہدایت) کے لیے ظہور میں لائی گئی ہے۔ تمہارا کام یہ ہے کہ نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو''۔ (آل عمران:۱۱۰) گویا نیکی پھیلانے اور معاصی کو روکنے کی جدوجہد ہر مسلمان کا فریضہ ہے' جس کی ادائیگی بے انتہا اجر کا باعث ہے اور اس سے روگردانی بڑی بدنصیبی اور اللہ کے حکم کی نافرمانی ہے۔ آپ ﷺ کا مشہور فرمان ہے ''جو کوئی تم میں سے کوئی بدی اور خلافِ شرع بات

دیکھے تو لازم ہے کہ (اگر طاقت رکھتا ہو تو) اپنے ہاتھ سے اس کو بدلنے کی کوشش کرے۔ اور اگر اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو پھر اپنی زبان سے اس کو بدلنے کی جدوجہد کرے۔ اور اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو اپنے دل میں تو اسے برا جانے' اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔'' (مسلم عن ابی سعید الخدریؓ) اسی لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جیسے ناگزیر عمل کی اہمیت سے غفلت عذابِ الٰہی کا موجب بن سکتی ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے: ''اے اہل ایمان! تم پر لازم ہے کہ اپنے نفسوں کی فکر کرو۔ گمراہ ہونے والے لوگ تمہارا کچھ نہ بگاڑیں گے جب کہ تم ہدایت پر ہو۔'' (المائدۃ:۱۰۵) اس سے بعض لوگوں نے یہ سمجھا کہ ہر شخص کو بس اپنی فکر کرنی چاہیے۔ جب وہ خود راہِ راست پر چل رہا ہے' نیکی کے کام کر رہا ہے اور برائیوں سے بچ رہا ہے تو اس پر دوسرے بگڑے ہوئے لوگوں کی اصلاح کی ذمہ داری نہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق ؓ کو یہ معلوم ہوا تو آپؓ نے فرمایا: کسی کو اس آیت سے غلط فہمی نہ ہو' میں نے خود رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے' آپؐ فرماتے تھے: ''جب لوگوں کا یہ حال ہو جائے کہ وہ شریعت کے خلاف کام ہوتے دیکھیں اور اس کی اصلاح کے لیے کچھ نہ کریں تو قریبی خطرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان سب پر عذاب آ جائے۔'' (سنن ابن ماجہ' جامع ترمذی)۔ قرآن وحدیث کے دوسرے نصوص کی روشنی میں محولہ بالا آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب تم اپنی استطاعت کے مطابق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کر چکے اور اس کے باوجود بد اطوار اور ناخدا ترس لوگ ہدایت قبول نہ کریں اور گمراہی ہی کی حالت میں رہیں تو پھر ان کی معصیت کوشی کی ذمہ داری تم پر نہیں' تم اللہ کے نزدیک بری ہو۔ یہ ہے اس آیت کا صحیح مطلب۔

اسی چیز کی تائید رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان سے ہوتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''کسی قوم میں کوئی آدمی ہو جو ایسے اعمال کرتا ہو جو گناہ اور خلافِ شریعت ہیں اور اس قوم اور جماعت کے لوگ اس کی قدرت اور طاقت رکھتے ہوں کہ اس کی اصلاح کر دیں اور اس کے باوجود اصلاح نہ کریں (اس کو اسی حال میں چھوڑے رکھیں) تو ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ مرنے سے پہلے کسی عذاب میں مبتلا فرمائے گا۔'' (سنن ابن ماجہ) اس امر کی مزید وضاحت فرماتے ہوئے آپؐ نے کسی پہلے زمانے کا یہ واقعہ بیان کیا کہ کوئی بستی تھی (جس کے باشندے عام طور پر سخت فاسق وفاجر تھے) اللہ تعالیٰ نے جبریلؑ کو حکم دیا کہ فلاں بستی کو اس کی پوری آبادی کے ساتھ

الٹ دو۔ جبرئیل نے عرض کیا: پروردگار! اس شہر میں تیرا فلاں بندہ بھی ہے جس نے آنکھ جھپکنے کے برابر بھی تیری کبھی نافرمانی نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا کہ اس بستی کو اس بندے پر اور اس کے دوسرے سب باشندوں پر الٹ دو' کیونکہ ایک ساعت کے لیے بھی اس بندے کا چہرہ میری حمیت کی وجہ سے متغیر نہیں ہوا۔ (شعب الایمان)

گویا اپنے اردگرد کے ماحول میں برائیوں کا ارتکاب کرنے والوں کو برداشت کرنے اور ان کی اصلاح کے لیے کوشش نہ کرنے سے انسان ان بدعملوں کا ساتھی شمار ہوتا ہے۔ اور اگر مجرم لوگ کسی عذاب میں مبتلا ہوتے ہیں تو یہ بھی اس عذاب میں ڈالا جائے گا۔

اس اہم فریضے کی غفلت جہاں انسان کو عذاب میں مبتلا کر دینے کا باعث ہو سکتی ہے وہیں نیکی پھیلانے اور بدی کو مٹانا بہت بڑا فضیلت کا کام ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر برابر کرتے رہو...... یہاں تک کہ جب (وہ وقت آ جائے) کہ تم دیکھو کہ بخل اور دولت اندوزی کے جذبہ کی اطاعت کی جاتی ہے اور اپنی خواہشات کا اتباع کیا جاتا ہے اور بس دنیا ہی کو مقصود بنا لیا گیا ہے اور ہر شخص خود رائی اور خود بینی کا شکار ہو گیا ہے تو اس وقت بس اپنی ذات ہی کی فکر کرو اور عوام کو چھوڑ دو۔ کیونکہ تمہارے بعد ایسا دور بھی آئے گا کہ صبر اور ثابت قدمی اختیار کرنا ایسا (مشکل) ہو گا جیسے ہاتھ میں انگارہ لے لینا۔ ان دنوں میں شریعت پر عمل کرنے والوں کو تمہاری طرح عمل کرنے والے پچاس آدمیوں کے برابر اجر و ثواب ملے گا۔ (جامع ترمذی)

آج کے برے ماحول میں نافرمانیوں اور معصیت کے کام دیکھ کر پرسکون اور بے فکر رہنا دین کے تقاضوں سے غفلت کی علامت ہے۔ شریعت کے احکام کی پابندی نہ کرنے والوں کی اصلاح کے لیے اپنے پورے وسائل اور صلاحیت استعمال کرنا ضروری ہے۔ چونکہ ایسا کرنا آسان نہیں رہا اس لیے جو ایسا کرے گا حضور ﷺ کی بشارت کے مطابق وہ آپؐ کے زمانے کے پچاس افراد کے برابر اجر پائے گا۔ ضروری امر یہ ہے کہ داعی خود نمونہ بنے' اچھے کام کرے اور برے کاموں سے متنفر ہو۔ حلال خور اور خوش اخلاق ہو۔ دعوت کے آداب سے واقف ہو۔ اس طرح اس کی کوشش نتیجہ خیز ہو گی' ورنہ اس کی دعوت نہ صرف بے نتیجہ رہے گی بلکہ اسلام سے نفرت کا باعث بن جائے گی۔

حاجی عبدالواحد صاحبؒ کی یادداشتیں (۱۰)

مرتب: پروفیسر حافظ قاسم رضوان

☆

مولانا محمد الیاسؒ (بانی تبلیغی جماعت) اور اباجی

مولانا محمد منظور نعمانیؒ اور مولانا علی میاںؒ کے ساتھ اباجی نے ۱۹۳۹ء میں ایک یادگار سفر کیا جس میں مختلف دینی اور روحانی مراکز کا مشاہدہ ہوا۔ انہی میں ایک تبلیغی جماعت کا مرکز بستی نظام الدین‘ دہلی بھی شامل تھا‘ جہاں ان تینوں حضرات کی مولانا محمد الیاسؒ (بانی تبلیغی جماعت) سے ملاقات ہوئی۔ اس مرکز میں آمد اور مولانا محمد الیاسؒ سے ملاقات کا محرک مولانا محمد منظور نعمانیؒ کی ذات ہی تھی جو اپنے دونوں ساتھیوں سے پہلے مولانا محمد الیاسؒ سے متعارف تھے۔

مولانا مودودیؒ نے تبلیغی جماعت کا حال سن کر میوات کے ایک مختصر سفر میں اس کے اثرات دیکھے اور ’ایک اہم دینی تحریک‘ کے عنوان سے اپنے رسالہ ترجمان القرآن بابت شعبان ۱۳۵۸ھ (۱۹۳۹ء) میں ان مشاہدات کا ذکر کیا۔ بقول اباجی مولانا کا یہ مضمون ہی تبلیغی جماعت سے ان کا پہلا تعارف تھا۔ اباجی بتایا کرتے تھے کہ جب وہ بلوچستان (جہاں وہ بسلسلہ ملازمت مقیم تھے) سے آکر مولانا محمد الیاسؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو مولانا نے تفصیل سے تقریباً دو گھنٹے لگا کر اپنی تحریک کا تعارف کروایا اور اس کے پھیلاؤ سے متعلقہ تجربات کا ذکر کیا۔ شروع میں مولانا محمد الیاسؒ نے میوات (جو جہالت و گمراہی کا گڑھ تھا) میں مدرسے قائم کیے اور وہاں کے لوگوں کو ترغیب دلائی کہ اپنے بچوں کو یہاں داخل کریں‘ لیکن یہ تجربہ کچھ زیادہ کامیاب نہ ہوا۔ جو نوجوان یہاں سے فارغ ہوتے وہ واپس اپنے ماحول میں جا کر بجائے کوئی نمونہ قائم کرنے کے اسی رنگ میں رنگے جاتے اور کوئی صحیح دینی اور تبلیغی خدمت سرانجام نہ دے پاتے۔ اس سے مایوس ہو کر مولانا محمد الیاسؒ نے ایک دوسرا تجربہ کیا اور میوات سے لوگوں کو دین سیکھنے کے لیے تبلیغی جماعت میں وقت دینے اور باہر کے علاقوں

میں تبلیغی گشت کرنے کے لیے تیار کیا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ بڑی عمر کے لوگوں نے باہر جا کر دینی ماحول میں دین سیکھا اور واپس آ کر اپنے اہل وعیال اور مقامی لوگوں کو دین سکھلایا۔ یوں ایک ایسا دینی ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی جس میں اپنے گرد و پیش میں دین کا نمونہ دیکھا جائے اور وہاں سے دین سیکھنے کی سعی کی جائے۔

اباجی کہا کرتے تھے کہ میری ملازمت بھی شعبہ تعلیم سے متعلق رہی ہے‘ جہاں اساتذہ کے لیے ریفریشر کورس ہوتے رہتے ہیں اور ان کی کارکردگی کو بڑھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ میں نے سوچا کہ اس مولوی بندے کو یہ خیال کہاں سے سوجھا کہ وہ اس کورس کی مانند تبلیغی گشتوں اور دوروں میں لوگوں کو اکٹھا کر کے دین سکھانے کی کوشش کرے اور مقامی کام کو بھی منظم کرے جس میں وہی دین سیکھنے سکھانے کی محنت ہو۔ مولانا محمد الیاسؒ نے اہل میوات کی کایا کیسے پلٹی اور ان کو کن حالات کا سامنا کرنا پڑا‘ اس کے لیے درج ذیل دو واقعات اہمیت کے حامل ہیں:

ایک دفعہ مولانا نے کسی گاؤں میں تبلیغی بات کرتے ہوئے ایک شخص پر محبت سے ہاتھ رکھ دیا۔ وہ اس طرز سے بگڑ گیا اور بولا: مولوی پرے ہٹ! اگر تو نے اب ہاتھ لگایا تو لٹھ ماروں گا۔ آپ نے فوراً اُس کے پاؤں پکڑ لیے اور فرمایا: پاؤں کو تو نہیں کہا تھا۔ مولانا کی یہ انتہائی تواضع اور انکساری دیکھ کر وہ پتھر دل انسان بھی پگھل گیا‘ ندامت سے سر جھکا لیا۔

ایک دوسری جگہ حضرت مولانا تشریف لے گئے اور ایک میواتی سے تبلیغی بات شروع کی۔ وہ اجڈ گنوار اتنا بگڑا کہ آپ کو گھونسہ رسید کر دیا۔ حضرت نحیفُ الجُثّہ تھے‘ گھونسہ کی تاب نہ لاسکے اور زمین پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر کے بعد حواس بجا ہوئے تو اطمینان سے اس کے دامن کو پکڑ کر فرمایا: اچھا تم اپنا کام کر چکے‘ اب میری بات سنو۔ یہ دیکھ کر وہ میواتی شرم سے پانی پانی ہو گیا اور حضرت کے قدموں میں گر کر بولا: مولوی مجھے معاف کر دے‘ ورنہ میری بخشش نہ ہو گی۔ (بزرگوں کی سوانح سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ دعوت و تبلیغ اسلام کا کام قربانی کے بغیر ممکن ہی نہیں‘ راقم)

مولانا محمد الیاسؒ کی اخلاص سے کی گئی محنت کے نتیجہ میں میواتی تبلیغی کام کی ریڑھ کی ہڈی بن گئے۔ آپ میواتیوں کے قدردان تھے‘ تو وہ بھی آپ کے ممنون تھے۔ ایک میواتی سے کسی بزرگ نے سوال کیا کہ تم تبلیغ کے دورے کس لیے کرتے ہو؟ اس نے نہایت سادگی اور متانت سے یوں جواب دیا: ہم جہالت میں پڑے ہوئے تھے‘ نہ ہم کو خدا کی خبر تھی‘ نہ رسول کی۔ اس مولوی کا خدا بھلا کرے‘ اس نے ہمیں سیدھا راستہ دکھایا۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ اپنے دوسرے بھائیوں تک یہ نعمت پہنچائیں جو ہمیں ملی ہے۔ اس دور کے ایک سن رسیدہ میواتی نے‘ میوات

کے ماضی اور حال کا فرق اس طرح واضح کیا: جن باتوں کے لیے پہلے بڑی کوششیں کی جاتی تھیں اور ایک بات بھی نہیں ہوتی تھی‘ وہ اب آپ ہی آپ ہو رہی ہیں‘ اور جن باتوں کو بند کرنے کے لیے پہلے بڑی لڑائیاں لڑی جاتی تھیں اور بڑا زور لگایا جاتا تھا اور ایک بات بھی بند نہیں ہوتی تھی‘ وہ اب بے کہے سنے خود بخود بند ہوئی جا رہی ہیں۔

اسی طرح اباجی مولانا محمد الیاسؒ کا ایک قول سنایا کرتے تھے کہ یہ تبلیغی گشت صحیح اصولوں کے مطابق ہوگا تو فائدہ مند رہے گا‘ ورنہ پھر یہ صرف ’مٹر گشت‘ رہ جائے گا‘ اس کی جڑ مقامی کام ہے۔ دوسرے یہ کہ حضرت مولانا نے تبلیغی کام ان آیات سے اخذ کیا: ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ..﴾ (آل عمران: ۱۱۰) اور ﴿اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا ......﴾ (التوبۃ: ۴۱) مقامی کام کی مولانا کے نزدیک تبلیغی تحریک میں بہت زیادہ اہمیت تھی اور وہ اس کو ریڑھ کی ہڈی کے برابر سمجھتے تھے اور اس کی کمزوری کو پوری تحریک کی کمزوری جانتے تھے۔

ذخیرۂ خطوط میں موجود مولانا منظور نعمانیؒ کے ایک خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ اباجی کا مولانا محمد الیاسؒ سے خط وکتابت کا سلسلہ بھی جاری رہا‘ مگر بدقسمتی سے ایسا کوئی خط محفوظ نہیں رہ سکا۔ تقریباً تین چار سال اباجی کا مولانا محمد الیاس سے جو تعلق رہا‘ اس میں اباجی مولانا کی شخصیت‘ ان کی خشیت اور دینی تحریک اور کام سے والہانہ لگاؤ سے اتنا متاثر ہوئے کہ ساری عمر اسے بھول نہ پائے۔ وقتاً فوقتاً میوات (علاقہ دہلی) کے ’تبلیغی انقلاب‘ کے حوالے سے مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دعوت کا ذکرِ خیر ہوتا رہا۔ اپنے دور کے تبلیغ والوں کو اباجی مولانا کے اصولوں پر پوری طرح عمل پیرا ہونے کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ مولانا محمد الیاسؒ کا بھی اباجی سے اتنا قلبی تعلق تھا کہ انہوں نے ’’فضائل نماز‘ مرتبہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ‘‘ ایک کتابچہ ’عزیزِ مکرم‘ کے خطاب سے اباجی کو ہدیہ کیا۔

تبلیغ کے حوالے سے اباجی دہلی کے تاجروں کا ایک قول میواتیوں کے بارے میں سنایا کرتے تھے کہ جن کو ہم اپنے پاس بیٹھنے بھی نہیں دیتے تھے‘ خدا نے انہیں ہمارا رہنما بنا دیا۔ واضح رہے کہ اہل میوات کو انگریزی کاغذات میں جرائم پیشہ کے خانہ میں لکھا جاتا تھا‘ لیکن تبلیغ کی برکت اور حرکت سے میوات ایک مثالی اسلامی علاقہ بن گیا۔

مولانا محمد الیاسؒ کی ولادت اپنے والد مولانا محمد اسماعیلؒ کے گھر ۱۳۰۳ھ (۱۸۵۸ء) میں ہوئی۔ اخترالیاس تاریخی نام ہے۔ بالکل ابتدائی تعلیم اپنے والد مولانا محمد اسماعیلؒ سے حاصل کی۔ میواتیوں میں دینی کام کی ابتدا آپ سے ہوئی تھی۔ بنگلہ والی مسجد‘ بستی حضرت نظام

الدین (جو بعد میں تبلیغی جماعت کا مرکز بنی) میں آپ کی سکونت تھی۔ ایک روز نماز کے وقت نمازی کی تلاش میں مولانا اسماعیل مسجد سے باہر نکلے۔ کچھ میواتی تلاشِ روزگار کے لیے دہلی جا رہے تھے۔ آپ نے پوچھا کہ وہاں کیا مزدوری ملے گی؟ انہوں نے بتلایا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر اتنی مزدوری یہیں مل جائے تو پھر جانے کی کیا ضرورت ہے؟ انہوں نے اس کو منظور کر لیا۔ آپ ان میواتیوں کو مسجد لے آئے اور نماز سکھانے اور قرآن پڑھانے لگے۔ یومیہ مزدوری ان کو دے دیتے اور پڑھنے سیکھنے میں مشغول رکھتے۔ کچھ دنوں کے بعد نماز کی عادت پڑ گئی اور انہوں نے مزدوری لینی چھوڑ دی۔ یہ بنگلہ والی مسجد کے درس کی بنیاد تھی اور یہ پہلے طالب علم تھے۔

مولانا الیاس ذرا بڑا ہونے پر ۱۵۔۱۳۱۴ھ میں بڑے بھائی مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ کے ساتھ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی خدمت میں گنگوہ آ گئے اور بھائی سے تعلیم کا سلسلہ شروع کر دیا۔ دس سال آپ نے مولانا گنگوہی کی خدمت اور صحبت میں گزارے اور بیعت کا تعلق قائم ہوا۔ ۱۳۲۶ھ میں مولانا محمد الیاسؒ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی خدمت اقدس میں دیوبند پہنچے اور دورۂ حدیث کیا۔ شیخ الہند آپ کے متعلق فرمایا کرتے تھے: میں جب مولوی الیاس کو دیکھتا ہوں تو مجھے صحابہؓ یاد آ جاتے ہیں۔ شیخ الہند کی زندگی میں آپ کا برابر ان سے تعلق رہا‘ اور ۱۹۳۰ء میں بمقام دہلی ان کی وفات کے موقعہ پر آپ ان کے سرہانے موجود تھے۔ پھر مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ سے تجدید بیعت ہوئی۔ ۱۳۲۸ھ میں مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور سے تدریس کا تعلق قائم ہوا۔ ۱۳۳۰ھ میں نکاح اور ۱۳۳۳ھ میں حج کا پہلا سفر ہوا۔ آپ کے سب سے بڑے بھائی مولانا محمد صاحبؒ کی وفات پر ۱۳۳۶ھ (۱۹۱۶ء) میں مولانا محمد الیاسؒ کے بستی نظام الدین منتقل ہونے کی تقریب یوں ہوئی کہ وہاں والد صاحب اور بڑے بھائی کے جاری کردہ مدرسہ کے متعلقین نے بہت زیادہ اصرار کیا کہ اب آپ یہاں رہ کر اس مدرسہ کو سنبھالیں اور چلائیں۔ مدرسہ میں درس وتدریس کے ساتھ آپ نے دعوت وتبلیغ کا آغاز بھی علاقہ میوات میں کر دیا۔ ۱۳۴۴ھ میں مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ کی معیت میں مولانا محمد الیاسؒ نے دوسرا حج کیا۔ واپسی پر آپ نے میوات میں باقاعدہ تبلیغی گشتوں کا آغاز کر دیا اور کئی سال یہ سلسلہ جاری رہا۔ ۱۳۵۱ھ میں مولانا محمد الیاسؒ نے تیسرا حج کیا اور عرب میں بھی دعوت وتبلیغ کا باقاعدہ آغاز ہو گیا۔ حج سے فراغت کے بعد مولانا نے میوات کے تبلیغی دورے اور گشت کے ساتھ دوسرے علاقوں میں بھی جماعتیں نکالنے کا ارادہ فرمایا اور کام کی ابتدا یو پی کے مغربی

حصے (ضلع مظفرنگر و سہارنپور) سے ہوئی اور پہلی تبلیغی جماعت مولانا کے آبائی وطن کاندھلہ بھیجی گئی۔ یوں آہستہ آہستہ تبلیغی تحریک پھیلنا شروع ہوئی۔

۱۳۵۶ھ (۱۹۳۸ء) میں مولانا محمد الیاسؒ نے مع متعلقین کی ایک جماعت کے حج کا آخری سفر فرمایا۔ اس سفر میں حجاز میں دعوت و تبلیغ کا کام پہلے سے بھی بڑھ کر ہوا اور بادشاہ سے بھی اس حوالے سے ملاقات ہوئی جو کہ مثبت رہی۔ واپسی پر آپ پہلے سے بھی زیادہ جوش و خروش سے دعوت و تبلیغ کا کام آگے بڑھانے کی تگ و دو میں مصروف ہو گئے۔ آہستہ آہستہ یہ تبلیغی تحریک میوات کے بعد صوبہ یوپی (اترپردیش) سے پھیلتی ہوئی آگے بڑھنا شروع ہوئی اور پھر پنجاب میں یہ پودا لگ گیا۔ ۱۳۶۰ھ مطابق ۱۹۴۱ء میں قصبہ نوح (ضلع گوڑگانواں) علاقہ میوات میں ۲۰‘۲۵ ہزار افراد پر مشتمل ایک عظیم الشان سہ روزہ تبلیغی اجتماع ہوا‘ جس میں بہت سے بزرگانِ دین بشمول مولانا حسین احمد مدنیؒ اور مفتی کفایت اللہؒ وغیرہ نے شرکت فرمائی۔ ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۹۴۳ء سندھ میں کام کا آغاز ہوا اور کراچی میں تبلیغی جماعت بھیجی گئی۔ ۱۳۶۲ھ ہی میں مولانا محمد الیاسؒ نے لکھنؤ کا تقریباً پانچ روزہ تبلیغی سفر کیا جس میں سید سلیمان ندویؒ کی معیت بھی رہی۔ واپسی پر کانپور میں دو روزہ قیام کر کے آپ دہلی پہنچے۔

اواخر ۱۹۴۳ء سے ہی آپ کو مرض الموت پیچش کی صورت میں شروع ہوا۔ مارچ ۱۹۴۴ء میں مولانا محمد الیاسؒ کی تحریک سے مدارس کے نامور علماء اور دوسرے بزرگوں نے ایک اجتماع تبلیغی مرکز میں منعقد کیا کہ اہل مدارس اس تحریک میں کیسے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ شرکاء میں مولانا محمد طیب‘ مفتی محمد کفایت اللہؒ‘ مولانا اعزاز علی‘ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا اور شاہ عبدالقادر رائے پوری وغیرہ رحمہم اللہ علیہم شامل تھے۔ جون ۱۹۴۴ء میں مدرسہ معین الاسلام‘ نوح (علاقہ میوات) کا سالانہ جلسہ تھا‘ جس میں پہلی مرتبہ بوجہ بیماری مولانا محمد الیاسؒ کی شرکت نہیں ہو رہی تھی۔ مولانا محمد یوسفؒ کی زیر امارت ایک بڑے تبلیغی قافلے نے اس میں شرکت کی۔ اس دوران علاج اور معالج تبدیل ہوتے رہے لیکن مولانا کی حالت میں کوئی خاص فرق نہ پڑا۔ خدام کی ایک جماعت ہمہ وقت خدمت کے لیے کمربستہ رہتی تھی۔ مولانا کے اس مرض الموت کے دوران ہی بعض نئے تبلیغی مراکز کی ابتدا ہوئی‘ جن میں بھوپال‘ جے پور اور مرادآباد قابل ذکر ہیں۔ آخری دنوں میں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ کے ساتھ شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ بھی تشریف لے آئے جس سے مولانا کو بہت خوشی ہوئی۔

وفات سے دو تین روز پہلے بارش ہونے کی وجہ سے ہوا میں کچھ نمی آ گئی۔ مولاناؒ کو ان

دنوں بہت گرمی محسوس ہوتی تھی جس کی وجہ سے دیر تک چارپائی باہر رہتی تھی۔ اس دوران ہی نمونیہ کا حملہ ہو گیا جس کا پتہ چلنے پر احتیاط کی گئی۔ لوگوں کو ذکر کرنے اور تبلیغ میں وقت دینے کی برابر تاکید رہتی اور مختلف تبلیغی جلسوں کے اہتمام کی طرف بھی ذہن متوجہ رہتا۔ اب بات کرنے میں بھی مشکل درپیش ہوتی اور بیچ بیچ میں غفلت کا اثر اور غشی کا دورہ پڑ جاتا۔ ایک بار دو گھنٹے کی غشی طاری ہوئی‘ یکایک آنکھیں کھلیں تو زبان پر یہ کلمات جاری ہو گئے: اَلْحَقُّ يَعْلُوْ اَلْحَقُّ يَعْلُوْ وَلَا يُعْلٰى، پھر تین دفعہ فرمایا: كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ (الروم:٤٧)۔ ایک دفعہ صبح کو آب زم زم پیتے ہوئے حضرت عمرؓ کی یہ دعا مانگی: اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِي الشَّهَادَةَ فِيْ سَبِيْلِكَ وَاجْعَلْ مَوْتِيْ فِيْ بَلَدِ رَسُوْلِكَ ۔

ایک دن معالج ڈاکٹر نے کہا کہ ان کے تمام اعضاء ایک ایک کر کے ماؤف ہو چکے ہیں‘ صرف قلب کی طاقت ہے جو ان کو تھامے ہوئے ہے۔ جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں یہ جسمانی نہیں بلکہ روحانی طاقت ہے‘ جس کو عام لوگ نہیں سمجھتے۔ ۱۲ جولائی ۱۹۴۴ء کے دن مولانا محمد الیاسؒ کی طرف سے شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ‘ شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ اور مولانا ظفر احمدؒ کو چند آدمیوں کے نام بشمول مولانا محمد یوسفؒ بھیجے گئے کہ آپ ان میں سے جسے مناسب سمجھیں‘ اس کے ہاتھ پر لوگوں کی بیعت کرا دیں۔ ان حضرات نے مشورہ کر کے مولانا کی خدمت میں گزارش کی کہ مولوی یوسف صاحب ماشاء اللہ ہر طرح سے اہل ہیں۔ ان کے جواب میں مولانا الیاسؒ نے فرمایا کہ اگر تم (لوگوں) نے یہی انتخاب کیا ہے تو اللہ تعالیٰ اس میں خیر و برکت ڈالے گا‘ مجھے منظور ہے۔ امید ہے کہ‘ ان شاء اللہ‘ میرے بعد کام چلے گا۔ آخری رات زیادہ تر یہ دعا وردِ زبان رہی: اَللّٰهُمَّ اِنَّ مَغْفِرَتَكَ اَوْسَعُ مِنْ ذُنُوْبِيْ وَرَحْمَتَكَ اَرْجٰى عِنْدِيْ مِنْ عَمَلِيْ (اے اللہ! تیری مغفرت میرے گناہوں سے زیادہ وسیع ہے اور مجھے اپنے عمل سے زیادہ تیری رحمت کا آسرا ہے)۔ زندگی کی آخری شب میں پچھلے پہر اپنے صاحبزادے مولانا محمد یوسفؒ سے فرمایا: یوسف آ مل لے‘ ہم تو چلے۔ صبح کی اذان سے پہلے ۲۱ رجب ۱۳۶۳ھ مطابق ۱۳ جولائی ۱۹۴۴ء کو مولانا محمد الیاسؒ اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ نے نماز جنازہ پڑھائی اور غروبِ آفتاب سے پہلے دعوت و تبلیغ کا یہ آفتاب بنگلہ والی مسجد‘ بستی نظام الدین دہلی میں سپردِ خاک ہوا۔

جان ہی دے دی جگر نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا!

آخر میں مولانا محمد الیاسؒ کی تحریک دعوت وتبلیغ کا طریقہ، اصول اور مطالبے بھی مختصراً بیان کیے جاتے ہیں۔ طریقہ کار میں دینی اداروں اور اسلامی درسگاہوں کے ذریعے امت کے تمام طبقوں میں اسلامی دعوت پہنچانے والے داعی پیدا کیے جائیں، دین کے لیے نقل وحرکت اور سعی وعمل کو فروغ دیا جائے، دین کی تعلیم وتعلّم اور خدمت واشاعت کو مسلمانوں کی زندگی کا جزو قرار دیا جائے اور ہر مسلمان دین سیکھنے اور سکھانے کے لیے اپنے مشاغل اور ماحول کو چھوڑ کر کچھ عرصہ دوسری جگہ جائے۔ چھ لازمی اصول ہیں: (۱) کلمہ کی تصحیح (۲) نماز کی تصحیح (۳) علم و ذکر کی تحصیل (۴) اکرامِ مسلم (۵) تصحیح نیت اور (۶) تفریغِ وقت (یعنی وقت فارغ کرنا) (ان کو عرفِ عام میں تبلیغ کے ''چھ نمبر'' بھی کہتے ہیں)۔

اس طریقہ کار اور اصولوں کے ساتھ مولانا محمد الیاسؒ نے حسب ذیل مطالبے رکھے:
(الف) ہر ہفتہ کچھ وقت کے لیے اپنے مقامی ماحول میں ضروریاتِ دین (کلمہ، نماز وغیرہ) کی تبلیغ کرنا، نیز ایک امیر اور نظام کے تحت اپنے علاقے اور قرب وجوار میں گشت کرنا۔ (ب) ہر مہینے تین دن کے لیے میواتی پانچ کوس کے اندر جو گاؤں ہوں، وہاں تبلیغ کے لیے جائیں (جس کو میوات میں 'پنج کوسہ' کی اصطلاح سے یاد کیا جاتا تھا) اور شہری مضافات اور دوسرے شہروں میں جا کر تبلیغی گشت اور دعوت کا کام کریں اور دوسروں کو نکلنے پر آمادہ کریں۔ (ج) کم سے کم چار مہینوں (۳ چلے) کے لیے مسلمان دین سیکھنے کے لیے گھروں سے نکلیں اور ان مرکزوں میں جائیں جہاں دین اور علم زیادہ ہے۔ اس دعوتی سفر اور نقل وحرکت کے لیے ایک مکمل نظام الاوقات مرتب کیا جائے جس کے تحت جماعتیں اپنا وقت گزاریں۔

اب حضرت مولانا محمد الیاس ؒ کے کچھ فرمودات پیش خدمت کیے جاتے ہیں:

(۱) اس کام (دعوت وتبلیغ) کا مزاج اپنوں اور غیروں کی جھیلنا ہے۔ اس کام پر جب بھی کوئی خطرہ یا رکاوٹ آئے گی، وہ کام کرنے والوں کی غلطی سے آئے گی۔ اس میں جماعتی عصبیت، غرور اور افتراق زہر کی مانند ہیں۔

(۲) اللہ کے حکم پر جان دینے کا رواج ڈالنا اس دعوت کی روح ہے۔

(۳) جان قربان ہو جائے، دین زندہ ہو جائے، یہ جہاد ہے۔

(۴) تبلیغ کے اس کام میں غلطی بہت جلد تباہ کر دے گی۔

(۵) کام تمام شریعت کے ماتحت، نیت خالص اللہ کے لیے، بس یہ طریقت (تصوف) ہے۔

(۶) دعا اضطراب کے وقت قبول ہوتی ہے۔

(۷) تمام چیزیں وابستہ ہیں دین سے، اور دین وابستہ ہے ایمان سے، اور ایمان وابستہ ہے کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمدٌ رسول اللہ سے۔

(۸) تبلیغ سے مراد اپنی اصلاح ہو، دوسروں کی ہدایت کا ارادہ نہ کرے۔

(۹) تبلیغ کی جڑ اللہ کے خوف اور جنت کی طمع میں ذکر کی کثرت ہے اور حضورﷺ کی سنت کے شوق میں اور دین کے پھیلانے کا چاؤ ہے۔ اس چاؤ (رغبت اور شوق) سے جب تبلیغ کی جائے، تو بڑی برکت ہوگی۔

(۱۰) اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ (شریعت) کَاَنَّکَ تَرَاہُ (طریقت)۔

(۱۱) میرے دل کی تمنا ہے کہ کم سے کم میرا دماغ اور خیال اور وقت اور قوت اس امر (دعوت و تبلیغ) کے سوا ہر چیز سے فارغ رہے۔

(۱۲) جب تک عوام کے سامنے عملی نمونہ نہ ہو، محض منبروں پر کی گئی تقریر عمل پر پڑنے کے لیے کافی نہیں ہو سکتی۔ اگر تقریر کے بعد عمل پر پڑنے کی تجویز وتشکیل نہ ہو تو عوام کے اندر ڈھٹائی اور بے ادبی کے لفظ بولنے کی عادت پڑ جائے گی۔

(۱۳) جب تک عام آدمیوں میں دین نہ آئے، کچھ نہیں ہو سکتا۔

(۱۴) تمام خیروں اور برکتوں کی جڑ خشیت ہے، یہ خلاصہ ہے ہماری تبلیغ کا۔ اور یہ خشیت حضورﷺ کی اتباع کے ساتھ ہے۔ حضورﷺ کے لائے ہوئے دین پر کامل یقین کرو، کیونکہ یہ دین پہلے تمام دینوں کی روح ہے۔

(۱۵) اسباب کا نہ کرنے والا زندیق اور پھر اسباب پر نظر رکھنے والا مشرک۔

(۱۶) دوسرے حج کے حوالے سے مولانا محمد الیاسؒ فرماتے ہیں کہ مدینہ طیبہ کے قیام کے دوران مجھے اس کام کے لیے امر ہوا اور یوں ارشاد ہوا کہ 'ہم تم سے کام لیں گے'۔ کچھ دن میرے اس بے چینی میں گزرے کہ میں ناتواں کیا کام کر سکوں گا۔ کسی عارف سے ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا کہ پریشانی کی کیا بات ہے۔ یہ تو نہیں کہا گیا کہ تم کام کرو گے، یہ کہا گیا ہے کہ ہم تم سے کام لیں گے۔ بس کام لینے والے کام لے لیں گے۔ اس سے بڑی تسکین ہوئی۔

(۱۷) اپنے پرانے رفیق کار میاں جی محمد عیسیٰ کو ایک مکتوب میں تحریر فرمایا: عیسیٰ تم غور تو کرو، دنیائے فانی میں کام کے لیے تو گھر کے سارے افراد ہوں اور اس (دعوت وتبلیغ) کے لیے صرف ایک آدمی کو کہا جائے اور اس پر بھی نباہ نہ ہو، تو آخرت کو دنیا سے گھٹایا یا نہیں گھٹایا؟

(۱۸) وفات سے پہلے حضرت مولانا کا ایک قول ہے کہ 'لوگ آدمی چھوڑ کر جاتے ہیں' میں اپنے پیچھے الحمدللہ پورا ملک چھوڑ کر جارہا ہوں۔

(۱۹) اصل تبلیغ صرف دو امر کی ہے' باقی اس کی صورت گری اور تشکیل ہے۔ ان دو چیزوں میں ایک مادی ہے اور ایک روحانی۔ مادی سے مراد جوارح سے تعلق رکھنے والی' سو وہ تو یہ ہے کہ حضور ﷺ کی لائی ہوئی باتوں کو پھیلانے کے لیے ملک بہ ملک اور اقلیم بہ اقلیم جماعتیں بنا کر پھرنے کی سنت کو زندہ کر کے فروغ دینا اور پائیدار کرنا۔ روحانی سے مراد جذبات کی تبلیغ یعنی حق تعالیٰ کے حکم پر جان دینے کا رواج ڈالنا' یعنی اللہ کی باتوں اور اوامر خداوندی میں جان کا بے قیمت اور نفس کا ذلیل ہو جانا۔

(۲۰) مولانا محمد منظور نعمانیؒ سے ایک مرتبہ مخاطب ہو کر فرمایا: مولانا! ہماری تبلیغ میں علم اور ذکر کی بڑی اہمیت ہے۔ بدون علم کے نہ عمل ہو سکے نہ عمل کی معرفت' اور بدون ذکر کے علم ظلمت ہی ظلمت ہے' اس میں نور نہیں ہو سکتا۔ مگر ہمارے کام کرنے والوں میں اس کی کمی ہے (مراد یہ کہ عوام کی نسبت علماء اور اہلِ ذکر ابھی بہت کم آئے ہیں)۔

(۲۱) ہماری تبلیغ کا اصل مقصد طاغوت سے ہٹنا اور اللہ کی طرف رجوع کرنا ہے' اور یہ بدون قربانی کے نہیں ہو سکتا۔ دین میں جان کی بھی قربانی ہے اور مال کی بھی۔

(۲۲) ہماری اس دینی دعوت میں کام کرنے والے سب لوگوں کو یہ بات اچھی طرح سمجھا دینی چاہیے کہ تبلیغی جماعتوں کے نکلنے کا مقصد صرف دوسروں کو پہنچانا اور بتانا ہی نہیں' بلکہ اس ذریعہ سے اپنی اصلاح اور اپنی تعلیم و تربیت بھی مقصود ہے۔ لہٰذا نکلنے کے زمانہ میں علم اور ذکر میں مشغولیت کا بہت زیادہ اہتمام کیا جائے' علم دین اور ذکر اللہ کے اہتمام کے بغیر نکلنا کچھ بھی نہیں ہے۔

(۲۳) دین کے کام کے لیے پھرنے والوں کو چاہیے کہ گشت اور چلت پھرت کے طبعی اثرات کو خلوتوں کے ذکر و فکر کے ذریعے دھویا کریں۔

(۲۴) حقیقی ذکر اللہ یہ ہے کہ آدمی بس جس موقع پر اور جس حال اور جس مشغلہ میں ہو' اس کے متعلق اللہ کے جو احکام و اوامر ہوں' ان کی نگہداشت رکھے۔ اور میں اپنے دوستوں کو اسی ''ذکر'' کی زیادہ تاکید کرتا ہوں۔

(۲۵) جب تک عام آدمیوں میں دین نہ آئے' کچھ نہیں ہو سکتا۔

وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں
نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی' ارادت ہو تو دیکھ ان کو
ید بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں!

❀❀❀

مولانا محمد الیاسؒ کی جانب سے اباجی کو عطا کردہ کتابچہ ''فضائل نماز'' (مطبوعہ ۱۳۵۸ھ/۱۹۴۰ء) کے کور کا عکس' جس پر مولانا کے ہاتھ سے یہ عبارت تحریر ہے:

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم

لَنْ يُّشَادَّ هٰذَا الدِّيْنَ اَحَدٌ اِلَّا غَلَبَهٗ فَسَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا

ہدیہ بعزیز مکرم مولوی عبدالواحد سلمہٗ

از بندۂ ناچیز محمد الیاس

دہلی' ۱۷ ذی قعدہ ۵۸ھ

مطابق ۹ جنوری ۴۰ء

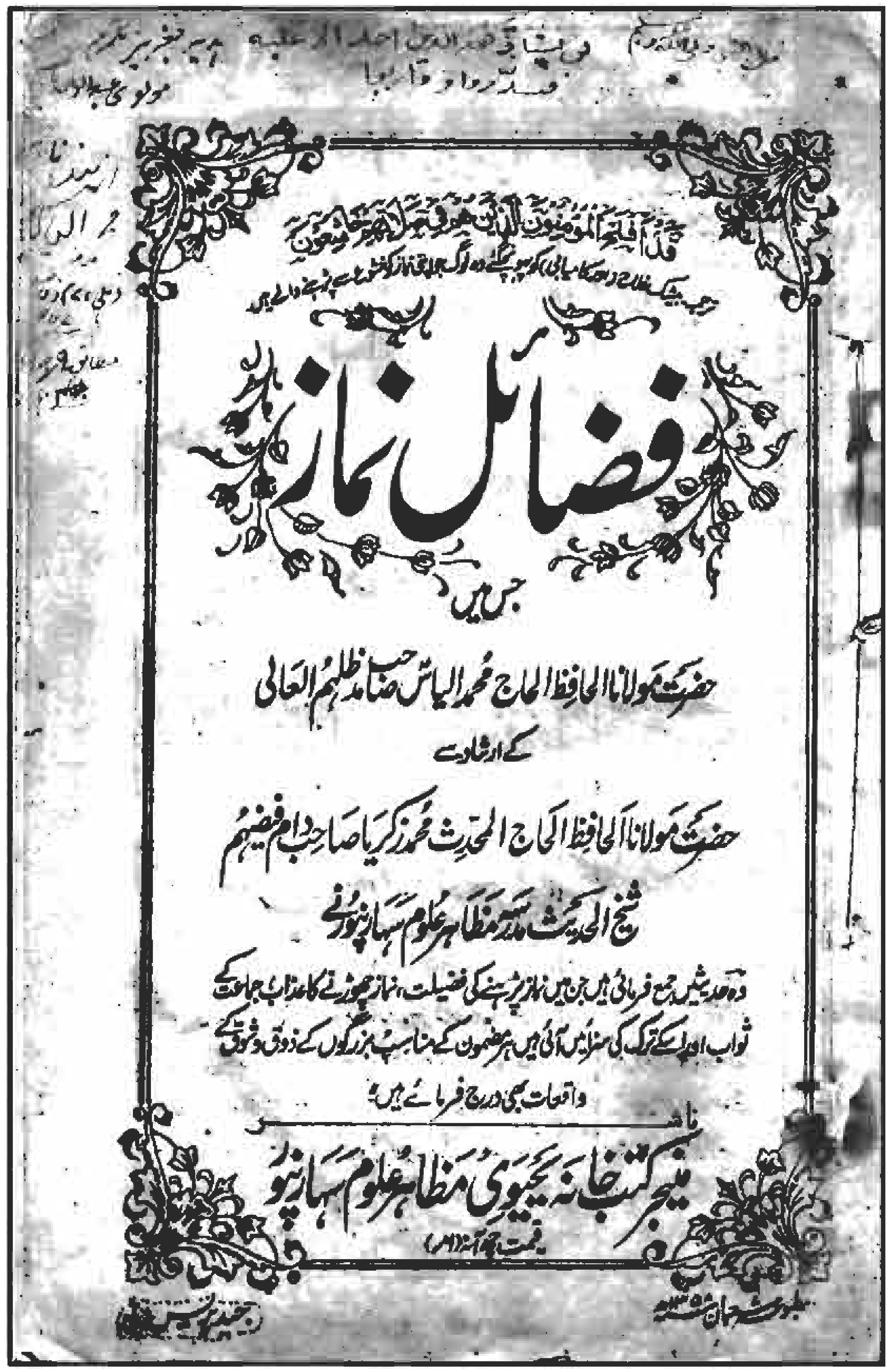

Nov. 2016
Vol. 65

Regd. CPL No. 115
No.11

Monthly **Meesaq** Lahore

رسولِ اکرم ﷺ کی عظمت، آپ ﷺ کے مقصدِ بعثت، اسوۂ رسول ﷺ کے قرآنی تصور، سیرتِ نبوی ﷺ کے مختلف گوشوں، خاص طور پر آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے انقلابی پہلو جیسے علمی و عملی موضوعات پر 9 کتابوں کا مجموعہ

رسولِ اکرم ﷺ اور ہم

از ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ

دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ

516 صفحات پر مشتمل فکرانگیز تالیف

اشاعت خاص (مجلد):
امپورٹڈ آفسٹ پیپر، قیمت: 450 روپے

اشاعت عام (پیپر بیک):
امپورٹڈ بک پیپر، قیمت: 300 روپے

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور فون: 3-042-35869501

maktaba@tanzeem.org